گیت سناتی ہے ہوا
راشد انور راشد
SAREERAZ

گیت سناتی ہے ہوا

(شاعری)

راشد انور راشدؔ

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دلّی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

نام کتاب : گیت سناتی ہے ہوا
شاعر وناشر : راشد انور راشد
تعداد : 500
مطبع : جواہر آفسیٹ پرنٹرس، دہلی
کمپوزنگ : محمد شاہد عالم
صفحات : 246
زیر اہتمام : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

GEET SUNATI HAI HAWA (Poetry)
By: RASHID ANWAR 'RASHID'
Edition: 2015 Rs: 300/-

ملنے کے پتے
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔6
- کتب خانہ انجمن ترقی، جامع مسجد، دہلی 011-23276526
- رائی بک ڈپو، 734، اولڈ کٹرہ، الہ آباد۔ 09889742811
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
- بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔4
- کتاب دار، ممبئی۔ 022-23411854
- ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد
- مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد۔
- عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ
- قاسمی کتب خانہ، جموں توی، کشمیر
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob: +91 9971775969, +919899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

انتساب

وارث علوی کے نام
جن کے
پیہم اصرار سے
یہ مجموعہ مکمل ہو پایا!

یہ خبر دی ہے پرندوں نے چلو سنتے ہیں
جھیل کے پاس کوئی گیت سناتی ہے ہوا

راشدؔ

فہرست

- نظمیں:

●●●

فطرت کے اسرار کی معنویت

قاضی عبدالستار

بہت دن ہوئے جب میں لکھنؤ یونیورسٹی میں بی.اے کا طالب علم تھا اور پروفیسر احتشام حسین کا چہیتا شاگرد تھا، ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ وہ اپنے ڈرائنگ روم میں سر جھکائے بہت اداس بیٹھے ہیں۔ میں نے ڈبل ڈور پر کھڑے ہوکر اجازت مانگی اور داخل ہوا۔ ہاتھ کے اشارے سے حکم ہوا کہ بیٹھ جاؤ۔ تھوڑی دیر کی تکلیف دہ خاموشی کے بعد میں نے عرض کیا کہ سر کیا آپ کی طبیعت ناساز ہے؟ سر اُٹھایا۔ ان کا سرخ وسفید چہرہ بھر بھرایا ہوا تھا۔ نہیں میں ٹھیک ہوں، لیکن ایک عجیب بات ہے کہ لوگ کتابیں لکھتے ہیں، گھر آکر دے جاتے ہیں، تیسرے دن سے فرمائش ہونے لگتی ہے کہ اپنی قیمتی رائے کا اظہار کردیجیے۔ ۲۴ گھنٹے میرے پاس بھی ہیں۔ میرا اپنا گھر ہے، گھر کی ذمے داریاں ہیں جو وقت طلب کرتی ہیں۔ پھر اپنا پڑھنا پڑھانا ہے جو خاصا وقت چاہتا ہے۔ ان تمام مصروفیات کے بعد جو وقت بچتا ہے وہ لکھنے پڑھنے میں صَرف ہوتا ہے۔ اب اگر میں صرف کتابوں پر تبصرے کرتا رہوں تو کیا یہ مناسب ہوگا، اور اگر میں اپنی ''قیمتی رائے'' کا واقعی اظہار کردوں تو مصنفین صاحبان کا کیا حال ہوگا۔ مجھ پر تبرّہ بھیجتے نظر آئیں گے۔ وہ دیر تک اس موضوع پر بولتے رہے۔ میں نے وہیں طے کرلیا کہ اگر میری کوئی کتاب شائع ہوگی تو میں اپنے اساتذۂ کرام کو اور نقادوں کو کبھی کوئی کاپی نہیں دوں گا۔ چنانچہ آج اس عمر میں بھی میں اپنی اس بات پر قائم ہوں۔ میں بی.اے آنرس میں تھا جب میری پہلی کتاب ''شکست کی آواز'' شائع ہوئی۔ میں نے کسی استاد کو، کسی نقاد کو، کسی میگزین کو کبھی نہیں بھیجی اور آخری کتاب ''تاجم سلطان'' بھی نہیں بھیجی۔

خیر اس لمبی چوڑی تمہید کی ضرورت یوں آپڑی کہ میں نے راشد انور راشد کی ایک کتاب ''کہرے میں ابھرتی پرچھائیں'' پڑھی اور اس پر اپنی رائے کے اظہار کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کتاب کی پہلی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ شروع سے آخر تک ایک افسانے کی طرح مربوط ہے۔ یعنی اگر یہ کہا جائے کہ پوری کتاب ایک تھیم پر لکھی گئی ہے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ ابتدائیہ بھی ہے، نقطۂ عروج بھی ہے اور اختتامیہ بھی ہے۔ آج شاعری پر جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں، محبت کے موضوع سے محروم نظر آتی ہیں۔ جیسے آج کی نسل عشق کرنا بھول گئی۔ اگر ایسا ہے تو انتہائی افسوس ناک ہے اور اگر عشق پر لکھنے کی توفیق نہیں ہے تو اس سے زیادہ افسوس ناک بات ہے۔ راشد کی پوری کتاب عشق پر مبنی ہے۔ کہیں غم روزگار کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ کہیں کہیں غم روزگار کی ایسی جھلکیاں نظر آتی ہیں جو فطری ہیں اور ضمنی ہیں۔ اس لیے نا قابلِ اعتنا نہیں۔

ابھی میں اس کتاب کے سحر میں مبتلا تھا کہ ان کی ایک اور کتاب ''گیت سناتی ہے، ہوا'' کا مسودہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کتاب نے مجھے ''کہرے میں ابھرتی پرچھائیں'' کے مقابلے میں زیادہ متاثر کیا۔ اس کا سبب غزلوں کی ردیفیں ہیں۔ یعنی ہر غزل کی ردیف مظاہر فطرت کے کسی نہ کسی پہلو پر مشتمل ہے۔ فطرت کے بہت سے مظاہر راشد کی غزلوں میں ردیف کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ ان منفرد غزلوں کی طرح نظموں میں بھی فطرت کے مظاہر اور انسانی رشتے کی وابستگی نمایاں ہے۔ اس مجموعے کی تمام نظمیں قدرت کے اسرار کی معنویت اور اس کے بیان سے مملو ہیں۔ یہ کام بھی اتنا ہی مشکل ہے۔ ٹھیک ہے ایک آدمی پوری پلاننگ کرتا ہے کہ ہم جتنی نظمیں کہیں گے وہ ایسے موضوعات پر ہوں گی۔ خود شاعر نے تخلیقیت کے ضمن میں شعوری اور لاشعوری کیفیت کی بحث کرتے ہوئے اس کا اعتراف کیا ہے، لیکن اعتراف اور چیز ہے اور اس پر عمل اور چیز اور اس عمل میں کامیابی سب سے مختلف چیز ہے۔ نظموں کے عنوانات سے بھی راشد کی انفرادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تمام نظمیں قدرت سے انسان کے لازمی رشتے کی وضاحت کرتی ہیں۔

اردو میں کوئی مجموعہ ایسا نہیں ہے کہ جس کی ہر غزل کا ہر شعر یا ہر نظم کا مجموعی تاثر، فطرت کے کسی نہ کسی پہلو کے نور سے منور ہو۔ بظاہر یہ کام بہت آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر اس پر عمل کیا جائے تو انتہائی دشوار ہے۔ اسی دشواری کی بنا پر ہی میں اس سے متاثر ہوا۔ ولی دکنی سے لے کر آج تک کسی شاعر نے اپنے کسی مجموعۂ کلام میں اس اہتمام و انصرام کے ساتھ فطرت کی نیرنگیوں کا تماشا کرنے کا حوصلہ نہیں کیا۔ نہ صرف تماشا کرنے کا بلکہ اس تماشے کو منظوم کر کے دکھانے کی جسارت انتہائی قابلِ تعریف ہے۔ جذبؔی صاحب کے انتقال کے بعد علی گڑھ شاعروں سے محروم ہو گیا تھا۔ راشد انور راشد کے نام نے علی گڑھ کی اس کمی کو پورا کیا ہے جو انتہائی مبارک باد اور قابلِ اعتنا ہے۔

○○○

تخلیقی بصیرت کی نئی منزل

شافع قدوائی

زمانۂ قدیم سے فنونِ لطیفہ علی الخصوص شاعری میں حیاتِ انسانی کے مظاہر فطرت سے انسلاک وارتباط اور پھران کی باہمی آویزش کی مختلف صورتوں کو موضوعِ سخن بنایا جاتا رہا ہے۔ فطرت کو انسانی خواہشات اور تمناؤں کی بازیابی کے ممکنہ ذریعہ کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ قدرتی مناظر کو الوہی صناعی کا مظہر اور بعض انسانی صفات اور احساسات کی فنی سطح پر تجسیم کے بنیادی رمز کی صورت میں قبول کیا جاتا رہا ہے۔ اردو شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے کہ انسان کے پیچیدہ داخلی حسّی تجربات کی ترسیل کا بنیادی حوالہ مناظر قدرت رہے ہیں اور پانی، ہوا، آگ اور مٹی سمیت اَن گنت قدرتی مظاہر کو علامت، استعارہ، تشبیہ اور بسا اوقات مجاز مرسل کے طور پر استعمال کیے جانے کی روش عام رہی ہے۔ بیانیہ اصنافِ سخن مثلاً مثنوی، قصیدہ، مرثیہ اور نظم کے علاوہ غزل میں بھی مناظر فطرت کو اساس شعری موتیف (Poetic motiff) کی طرح برتا گیا ہے۔ میر تقی میر کی مثنوی ''شکارنامہ'' سے لے کر نظیر اکبر آبادی کی موضوعاتی نظموں اور پھر اختر شیرانی و جوش ملیح آبادی نے ان مظاہر کی الوہیت کے مرئی اظہار (Physical manifestation) یا انسانی جذبات اور احساسات کے علامتی اظہار یا تخلیقی تتمہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ نوجوان شاعر راشد انور راشد نے مظاہر فطرت کی مروجہ صورتوں کو subvert کر کے قدرتی مناظر کو ایک وسیع تر حسیاتی سیاق عطا کیا ہے اور ایک نیا شعری محاورہ قائم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے دو شعری مجموعوں ''شام ہوتے ہی'' اور ''کہرے میں ابھرتی پرچھائیں'' میں یہ کوشش صاف

نظر آتی ہے اور اب ان کا تیسرا شعری مجموعہ ''گیت سناتی ہے ہوا'' تو مناظر فطرت کی نئی اور خیال انگیز فنی پیش کش کے حوالے سے مرتب اور متشکل ہوا ہے جو ان کی تخلیقی تازہ کاری پر دال ہے۔

۶۰ غزلوں اور ۶۰ نظموں پر مشتمل زیر مطالعہ مجموعہ تخلیقی سطح پر یہ باور کراتا ہے کہ قدرتی مظاہر محض صناعِ اوّل کی تخلیقی توانائی کو خاطر نشان نہیں کرتے بلکہ یہ بذاتِ خود ایک علیٰحدہ وجود رکھتے ہیں جو اصلاً virtue کی ایک شکل ہے۔ مجموعہ میں شامل نظموں اور غزلوں کے مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ شاعر کے نزدیک فطرت نہ تو انسان پر مہربان ہے اور نہ Hostile ہے۔ یہ اصلاً کائناتی تعینات میں مستور ایک ایسا حرکی نظام ہے جو تمام قوتوں میں مطابقت اور ہم آہنگی کے امکانات کو بروئے کار لاتا ہے۔ ہم آہنگی کا حصول فطرت کا خاصہ ہے۔ یعنی مظاہر فطرت ایک دوسرے کے خلاف صف آرا نہیں ہوتے اور نہ یہ ایک دوسرے کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپے ہوتے ہیں:

یہاں کبھی بھی خزاں کا گزر نہیں ہوگا
یہاں ہمیشہ رہے گا بہار کا موسم

شب کے ساحل پہ کئی جگنو دکھائی دیں گے
کوئی غم گین نہ ہو، گیت سناتی ہے ہوا

ایک دھندلا عکس روشن ہو رہا ہے ہر طرف
اس گھڑی تو کہکشاں کی پالکی لگتی ہے دھوپ

شاعر کو استحصال کسی بھی صورت میں منظور نہیں۔ حتیٰ کہ اسے مناظر فطرت یا پرندوں سے مقصد برآری بالکل پسند نہیں ہے۔ وہ اشیا کو ان کی افادیت (utility) کے بغیر بھی صدق دل سے قبول کرنے کا خواہاں ہے:

دنیا ترے نغموں کی دِوانی ہوئی لیکن
تو بھی ہے مرے واسطے انمول پرندے

خوب صورت نظارہ اپنا انعام خود ہے۔ سبزہ کی افادیت اسے استعمال کرنے میں نہیں بلکہ محض اس کی دید میں مستتر ہے:

یہ آنکھوں میں کیسی چمک آ گئی ہے
ستاروں سا اب جھلملاتا ہے سبزہ

اس مجموعے میں ہوا، برفیلی ہوا، گرم ہوا اور بادِ صبا کی ردیف پر مشتمل چھ غزلیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ندی، دریا، ریت، قوسِ قزح، آندھی، وادیٔ گل، درخت، پہاڑ کی برف، سبزہ، چھاؤں، موسم، پتھر، دھوپ، رات، زمین، چاندنی، پہاڑ، عندلیب، طوفان، سیلاب، صحرا، تاریکی، جزیرہ، بارش اور آبشار وغیرہ کی ردیف پر مبنی غزلیں شریکِ اشاعت کی گئی ہیں۔ شاعر کے نزدیک فطرت میں انسانی سرشت کے برخلاف غیر متوقع پن (unpredictibility) کا کوئی عنصر پوشیدہ نہیں ہوتا۔ نیز فطرت کے مظاہر میں تغیر و تبدل کے عمل کو انسانی افعال و اعمال سے مربوط کیا جا سکتا ہے۔ انسان ہمیشہ فطرت کے خلاف نبرد آزما نہیں رہتا بلکہ اکثر وہ اس کا شریک و سہیم بن جاتا ہے۔ راشدؔ نے ایک حقیقی تخلیقی فن کار کی طرح مروجہ تصورات کو subvert کیا ہے اور subversion کا عمل صرف انسانوں میں نہیں بلکہ پرندوں میں بھی نظر آتا ہے۔ شام کو پرندے گھونسلے کی طرف لوٹتے ہیں، مگر راشدؔ کی ایک نظم ''شام کی اڑان'' اس تصور کی تکذیب کرتی ہے۔ تنہائی کا احساس انسانی صفت ہے، تاہم پرندے بھی اس سے نا آشنا نہیں ہیں۔ رات جو عافیت اور سکون کی مظہر ہوتی ہے، اگر رفاقت میسر ہو، اگر یہ صورت نہیں ہے تو پھر رات، اضطراب اور تشنگی کے داعیوں کو متحرک کرتی ہے۔ شاعر کے نزدیک پرندے اور انسان میں قدرِ مشترک تنہائی ہے:

شام کے سرمئی اندھیرے میں
اک پرندہ اڑان بھرتا ہے
چاہتا ہے کسی کا ساتھ ملے
رات کی بے قراریوں کا عذاب
یاد کر کے وہ کانپ اُٹھتا ہے

اس لیے شام کے دھند لکے میں
گھونسلے کو وہ چھوڑ دیتا ہے
اور مسلسل سفر میں رہتا ہے
لیکن اس کا سفر سدا کی طرح
تشنگی کا عذاب سہتا ہے

راشدؔ نے مظاہر فطرت کو ایک دوسرے کے حریف کے طور پر نہیں بلکہ ایک دوسرے کے مونس و غم گسار کی صورت میں پیش کیا۔ اکثر کسی ایک مظہر قدرت کا فریضہ کوئی دوسرا انجام دیتا ہے تاکہ فطرت کا توازن برقرار رہے۔ بادل کا تفاعل زمین کو سیراب کرنا ہے اور سورج کی تمازت اسے تخلیقی توانائی سے بہرہ ور کرتی ہے، تاہم کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ سورج کی تمازت سے پانی کے امکانات بھی ہویدا ہوتے ہیں۔ گرمی سے زمین کی سطح پر شگاف پڑنے سے اس کی اندرونی توانائی کی بازیابی ہو جاتی ہے:

منظر بدلتا ہے
اچانک بادلوں کی اوٹ سے
سورج نکلتا ہے
زمیں کے سوکھے خطے
بادلوں کے رقص سے
محروم ہو کر
ٹوٹ جاتے ہیں
بہت آنسو بہاتے ہیں (بادلوں کا رقص)

آنسو بھی پانی کی ایک شکل ہے، یعنی اپنے درون میں اُتر کر فطرت اور انسان دونوں تخلیقی سرشاری سے متصف ہو سکتے ہیں۔

راشد انور راشد کا تازہ ترین مجموعۂ کلام نہ صرف موضوعاتی سطح پر تخلیقی بصیرت کی نئی منزلوں کا پتہ دیتا ہے بلکہ فنی سطح پر Poetic Discourse کے نئے محاورہ کو بھی قائم کرتا ہے۔ ناسپاسی ہوگی اگر ان خیال انگیز تخلیقات کی پذیرائی نہ کی جائے۔ ○○○

اعتراف

تخلیقی عمل اس قدر پُر اسرار ہوتا ہے کہ بیشتر اوقات خود تخلیق کار بھی اس کے نشیب و فراز سے اچھی طرح آگاہ نہیں ہو پاتا۔ شعور سے لاشعور اور لاشعور سے شعور کی منزلیں بھید بھرے سنگیت کے مترادف ہوتی ہیں کہ اس کا خالق بھی سُروں سے پھوٹنے والی سحر انگیز کیفیت سے انجان دکھائی دیتا ہے۔ تخلیقی عمل کی یہی پُر اسراریت، تخلیق کی معنویت اور بقا کی ضامن ہوتی ہے۔ شعور اور لاشعور کا امتزاج تخلیقی حسیت کو وقار بخشتا ہے اور بہت کچھ گرفت میں آنے کے بعد بھی کافی کچھ ہماری دسترس سے باہر رہتا ہے۔ شعوری کوشش، تخلیقی عمل کی منزلیں سر کرنے میں معاون ہوتی ہے، لیکن اس مرحلے میں کب اور کس طرح لاشعوری کیفیت شامل ہو جاتی ہے، اس کا احساس تخلیق کار کو بھی نہیں ہوتا۔ مختلف النوع کیفیات، شاعر کو تخلیقی اظہار کے لیے مضطرب کرتی ہیں۔ نت نئے خیالات کا اژدہام ذہن پر مسلسل دستک دیتا ہے۔ انوکھے جذبات کی ترنگیں ذہن و دل کے تاروں کو چھیڑتی ہیں۔ معمول سے ہٹ کر رونما ہوئے واقعات، خیال و خواب کی دنیا میں حشر بپا کر دیتے ہیں، اور پھر تخلیق کار ایک پُر اسرار عمل سے گزرنے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ یہاں تک کا معاملہ شعوری کاوش سے متعلق ہے۔ بے چینی کی کیفیت سے ذہن و دل میں انتشار برپا ہو جاتا ہے اور تخلیق کار قلم کا سہارا لے کر الفاظ کے وسیلے سے اپنے جذبات بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ بیان تو شعوری کاوش کی مختلف جہتوں کو نمایاں کرتا ہے، لیکن اس راہ میں قدم بڑھاتے ہی لاشعوری کیفیت کے مختلف ابعاد روشن ہوتے چلے جاتے ہیں اور پھر پُر اسراریت کا بھید بھرا عمل، خود تخلیق کار کو نت نئی آزمائشوں میں مبتلا کرتا چلا جاتا ہے۔

شاعری میں بلاشبہ بعض کیفیات، چند مصرعوں یا اشعار کی صورت میں اس طرح ادا ہو جاتی ہیں کہ ان میں نوک پلک درست کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی بلکہ اس کا خیال تک

نہیں آتا۔ گویا کہ وہ کیفیات ایک مخصوص سانچے میں ڈھلی ڈھلائی سامنے آجاتی ہیں اور مطالعے کے دوران ہمیں ان کی مخصوص نغمگی، روانی اور فطری بہاؤ کا اندازہ واضح طور پر ہو جاتا ہے، لیکن کسی بھی شعری متن کے تمام حصے اسی کیفیت کے تحت، عام طور پر وجود میں نہیں آتے۔ یہ تو ممکن ہے کہ اگر کوئی غزل سات آٹھ اشعار پر مشتمل ہو تو اس کے دو تین اشعار میں یہ کیفیت موجود ہو، یعنی وہ اس طرح وجود میں آئے ہوں کہ ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہو، لیکن غزل کے تمام اشعار میں یہی کیفیت برقرار ہو، ایسا بالعموم نہیں ہو پاتا۔ پہلے ایک دو شعر فطری انداز میں ہمارے ذہن کے پردے پر اُبھرتے ہیں، اور ان اشعار میں یقینی طور پر 'آمد' کی کیفیات شامل ہوتی ہیں، یعنی سب کچھ بنے بنائے سانچے میں ڈھلا ڈھلایا ہمارے سامنے آتا ہے، لیکن جب وہ اشعار ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ پوری غزل مکمل کی جائے تو غزل کے بقیہ اشعار ہماری شعوری کاوشوں کے ذریعے ہی وجود میں آتے ہیں۔ یہ شعوری کاوش کیا ہے جس میں ایک خاص نوع کی سنجیدگی کا دخل ہوتا ہے؟ غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہی شعوری کاوش دراصل بہتر اور معیاری شاعری کے لیے تمام تر فضا فراہم کرتی ہے۔ شاعری میں شعری مناسبتیں اور رعایتیں بہت بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ لفظ تو ہر شاعر استعمال کرتا ہے اور اپنی بساط کے مطابق ان میں معنی کی جہتیں بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن بہتر اور معیاری شاعر، ان لفظوں کے ذریعے شعری مناسبتوں اور رعایتوں کو تخلیقی سطح پر استعمال کر کے ان میں مفاہیم کی نیرنگیاں شامل کر دیتا ہے۔ نظم کی تخلیق کے دوران، غزل سے قدرے مختلف فضا دیکھنے کو ملتی ہے۔ غزل کے تمام اشعار ممکن ہے اس طرح وجود میں آئے ہوں جن میں کسی نوع کی تبدیلی کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہ ہو، لیکن نظم میں یہ کسی بھی طرح ممکن نہیں۔ غزل کے تمام اشعار جہاں مفہوم کی سطح پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں وہیں اشعار کے دونوں مصرعے باہم مربوط اور مکمل ہونے کی بنا پر حیرت انگیز اکائی کا نمونہ ہوتے ہیں، لیکن نظم میں چوں کہ ربط اور تسلسل لازمی طور پر موجود ہوتا ہے، اور بیان کی گئی مخصوص کیفیت کسی نہ کسی منطقی انجام سے دوچار ہوتی ہے، لہٰذا نظم کا تمام تر معاملہ شعوری کاوشوں سے متعلق ہے۔ غزل میں دو مصرعوں کا ننھا سا پیمانہ اختیار کیے جانے کے باوجود شعری تلازمات اور مناسبتوں کا تخلیقی استعمال اسے لاشعوری عمل کے بجائے شعوری عمل کے قریب کر دیتا ہے۔

نظم میں ربط اور تسلسل کے ساتھ کسی کیفیت کو منطقی انجام سے دوچار کرنے کی کوشش بھی شعوری عمل کے بغیر ممکن نہیں۔ گویا کہ غزل ہو یا نظم، دونوں سطح پر بہتر اظہار، سنجیدہ اور شعوری عمل کے ذریعے ہی تخلیقی اظہار کا حصہ بن پاتا ہے۔ مجموعی طور پر ایک بہتر فن پارہ شعوری اور لاشعوری کیفیت کے خوب صورت امتزاج سے وجود میں آتا ہے اور دراصل یہی بنیادی صداقت ہے۔

ایک سنجیدہ تخلیق کار اپنے فن پارے کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کی کوششوں میں مستقل طور پر مصروف رہتا ہے۔ شعری متن کے وجود میں آنے کے باوجود وہ اس کی نوک پلک درست کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ جب ایک وقفے کے بعد وہ اپنی شاعری کا تنقیدی محاسبہ کرتا ہے تو بہت سے الفاظ اور ان کے تخلیقی استعمال میں اسے تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنے تخلیقی مواد پر از سرِ نو غور و خوض کرتا ہے اور کئی نمایاں تبدیلیوں کو راہ دیتا ہے۔ ان تبدیلیوں سے اس کے شعری متن میں زیادہ کشش اور معنویت پیدا ہو جاتی ہے جس سے اس کا تخلیقی باطن زیادہ مطمئن دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک ایک لفظ کے لیے ستر ستر کنویں جھانکنے کی روایت پر پوری سنجیدگی کے ساتھ عمل پیرا دکھائی دیتا ہے۔ جب تک اس کا شعری باطن پوری طرح مطمئن نہیں ہو جاتا وہ تبدیلیوں کا سلسلہ جاری رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی شعوری کاوش کے ذریعے اپنے شعری متن کو بہتر، معیاری اور پُرکشش بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا، جب تک اس کا ذہن اور دل، طمانیت کے جذبوں سے سرشار نہیں ہو جاتا۔

شعوری اور لاشعوری عمل سے متعلق گفتگو پیشِ نظر مجموعے کے لیے ناگزیر تھی تاکہ اس میں شامل غزلوں اور نظموں کا تخلیقی جواز فراہم ہو سکے۔ ''گیت سناتی ہے ہوا'' میرا تیسرا شعری مجموعہ ہے اور اس کی تمام غزلیں اور نظمیں شعوری عمل کے ذریعے ہی وجود میں آئی ہیں لیکن میں صدقِ دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ میری شعوری کوشش کب لاشعوری کاوش میں تبدیل ہو گئی، خود مجھے بھی اس کا اندازہ نہیں ہو پایا۔ میرا پہلا شعری مجموعہ ''شام ہوتے ہی'' صرف غزلوں پر مشتمل تھا، جب کہ دوسرے شعری مجموعہ ''کہرے میں اُبھرتی پرچھائیں'' میں میں نے عشقیہ نظموں کو جگہ دی تھی۔ اس لحاظ سے پیشِ نظر مجموعہ گزشتہ دونوں مجموعوں سے تھوڑا مختلف اس لیے بھی ہے کہ اس میں دونوں اصناف شامل ہیں اور اس کی تمام

غزلیں اور نظمیں قدرت کے مختلف مظاہر سے متعلق ہیں۔ فطرت کی رنگینیوں کو شاعری کے قالب میں ڈھالنا شاعروں کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ شاعر، خواہ کتنے ہی انفرادی اور ذاتی خیالات و تجربات کا بیان اپنی شاعری میں کرے، اس کا شعری متن قدرت کے مظاہر سے علیحدہ نہیں رہ سکتا۔ چوں کہ کائنات کی ہر شے میں قدرت کے جلوے روشن ہیں، لہٰذا شاعر، لاشعوری طور پر بھی ان قدرتی مظاہر کا کوئی نہ کوئی حوالہ اپنے شعری متن میں ضرور پیش کرتا ہے۔ بہت سے شعرا نے فطرت کی رنگینیوں کو اپنی شاعری میں نمایاں کیا ہے، لیکن میری یہ حقیری سی کوشش ان نمونوں سے تھوڑی مختلف ہے۔ پیش نظر مجموعے کی تمام غزلیں اور نظمیں، قدرتی مظاہر کے ساتھ انسان کے فطری اور جذباتی محسوسات کی شمولیت پر اصرار کرتی ہیں۔ تمام غزلیں اور نظمیں شعوری عمل کے ذریعے وجود میں آئی ہیں، لیکن میں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ان میں محض تخلیق برائے تخلیق کا جذبہ شامل نہ ہو، اور ان شعری متون سے گزرتے ہوئے قاری اپنے انفرادی محسوسات کی جھلک بھی غزلوں اور نظموں میں دیکھ سکے جن میں شعور سے لاشعور یا لاشعور سے شعور کے مرحلے خود بخود شامل ہو گئے ہیں۔ گویا کہ شعوری عمل میں بھی انجذاب کی کیفیت شامل ہو جاتی ہے اور تخلیقی اظہار لاشعور کی گرفت سے یکسر آزاد نہیں رہ پاتا۔

ادب میں نئے نئے تجربے کیے جاتے رہے ہیں۔ کچھ تجربوں کو قبولیت کی سند حاصل ہوتی ہے تو بعض تجربے بری طرح ناکام ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر وہی تجربے کامیابی سے ہم کنار ہو پاتے ہیں جن میں ادب کی دیرینہ روایات کی پاسداری شامل ہوتی ہے۔ جن تجربوں میں محض اجتہادی رویوں کے وقتی جوش کو پیش نگاہ رکھا جاتا ہے، وہ بہت جلد قصۂ پارینہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور کبھی بھولے بھٹکے ان کا ذکر بھی ہوتا ہے تو قدرے منفی انداز میں۔ ادب کی دیرینہ روایات سے فرار کسی بھی صورت میں قابلِ قبول نہیں۔ بعض اصناف اپنی مخصوص ہیئت کے باوجود نئے تجربوں کو گوارا کر لیتی ہیں۔ نظم کی مختلف اصناف کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن کچھ اصناف ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی مخصوص ہیئت سے چھیڑ چھاڑ کسی بھی صورت میں تسلیم نہیں کی جاتی۔ اس ضمن میں غزل کی صنف میں کیے جانے والے نت نئے تجربوں کی ناکامیوں کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ غزل میں اینٹی غزل، ذو بحرین غزل اور نثری غزل کے تجربے بڑے طمطراق کے ساتھ کیے گئے لیکن سبھی بری طرح ناکام ہو گئے۔

ذو بحرین غزل اور نثری غزل کے تجربوں کو تو اوندھے منھ گرنا ہی تھا کہ وہ غزل کی متعینہ ہیئت کو مسخ کرنے کی کوشش تھی۔ اینٹی غزل کا تجربہ پوری طرح ناکام نہیں ہوا کیوں کہ اس میں غزل کے متعینہ ضابطوں کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے موضوعات کی انفرادی پیش کش پر توجہ صَرف کی گئی تھی۔ وقتی طور پر اس کا سلسلہ کچھ دنوں تک جاری تو رہا لیکن اسے بھی قبولیت کی سند حاصل نہیں ہو سکی۔ چوں کہ غزل کی صنف اپنی مخصوص تہذیب اور اقداری پیش کش پر حد درجہ اصرار کرتی ہے، لہٰذا اینٹی غزل کا تجربہ جو غزل کی ہیئت میں چھیڑ چھاڑ کے بجائے موضوعات کے البیلے برتاؤ سے متعلق تھا، اسے بھی غزل کی مخصوص تہذیب گوارہ نہ کر سکی۔ غزل میں عہد بہ عہد نت نئی تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی رہی ہیں لیکن تمام تبدیلیوں کا تعلق چوں کہ موضوعات کی انفرادی پیش کش سے رہا ہے، لہٰذا ان خوش گوار تبدیلیوں کا ہمیشہ ہی خیر مقدم کیا جاتا رہا۔ اس تناظر میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ غزل میں موضوعات کی بنا پر کیے جانے والے تجربے، نہ صرف غزل کے متعینہ حدود کے موافق ہیں بلکہ اس کے ذریعے پیش کش کی سطح پر غزل میں ایک نیا ذائقہ بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ میں نے پیش نظر مجموعے کی غزلوں اور نظموں میں اسی تجربے کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ نظم کی حد تک تو مجھے کوئی خاص محنت نہیں کرنی پڑی، لیکن غزل میں ایک نئے تجربے کو پیش کرنا مجھے مستقل طور پر ذہنی آزمائشوں میں مبتلا کرتا رہا۔ کسی مجموعے میں دو تین غزلیں تو ایسی نکل سکتی ہیں جن کی ردیفوں میں فطری مظاہر کو برتا گیا ہو، لیکن مکمل مجموعے کی تمام غزلوں میں اسی انداز کی کارفرمائی رہی ہو، ایسی ایک بھی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ مجھے اپنے مقصد میں کہاں تک کامیابی مل پائی ہے اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کریں گے۔

فطرت کے مظاہر سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ گرمی کی راتوں میں چھت پر لیٹے وسیع و عریض آسمان میں جگ مگ کرتے تاروں کو گھنٹوں دیکھنا میرا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ دن میں جھلسا دینے والی گرمی کے بعد، رات کی تاریکی میں چاندنی راتوں کی ٹھنڈک فرحت بخش تازگی سے ہم کنار کرتی رہی ہے۔ جاڑے کی نرم دھوپ ذہن و دل میں تازگی اور حرارت پیدا کرتی ہے تو نسیمِ سحر کے خوش گوار جھونکوں سے وجود کی وادی سرشار ہو جاتی ہے۔ نیلگوں آسمان کی وسعتیں، سمندر کی طغیانی، ندی کا شور، جھیل کی خاموشی، ہوا کی سرسراہٹ، پرندوں کی چہچہاہٹ، کلیوں کی مسکراہٹ، بوندوں کا سرگم، بہار کی رعنائی،

غرض کہ کائنات کی ہر شے مجھے شروع سے ہی اپنی جانب کھینچتی رہی ہے۔ فطرت کے ان مظاہر میں نہ صرف میں خالقِ کائنات کے جلوے دیکھتا ہوں بلکہ انسانی زندگی سے ان کے لازمی انسلاک پر مسلسل غور بھی کرتا ہوں۔ جہاں کہیں بھی مجھے توازن اور اعتدال کی صورت دکھائی دیتی ہے، دل کو یک گونہ سکون حاصل ہوتا ہے، لیکن توازن میں کمی کا معاملہ مجھے اندر سے مضطرب کر دیتا ہے۔ میری شدید خواہش ہوتی ہے کہ کسی بھی طرح یہ توازن بحال ہو جائے، لیکن جب ہر طرف مایوسی دکھائی دیتی ہے اور صورت حال دن بہ دن مزید پیچیدگی اختیار کرتی چلی جاتی ہے تو احتجاج کی صورت میں فطری ردِعمل سامنے آتا ہے۔ اس ردِعمل میں کرختگی کا دخل نہیں ہے، لیکن اس مجموعے کی غزلوں اور نظموں میں خاموش اور فطری ردِعمل کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

میری اب تک شائع شدہ کتابوں میں تنقیدی کتابوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس بنا پر اکثر لوگوں کو یہ گمان گزرتا ہے کہ میں نے تخلیق کے بجائے تنقید کو اپنی ترجیحات میں شامل کر رکھا ہے۔ تنقید سے مجھے دلچسپی ضرور ہے، لیکن یہاں میں واضح طور پر اس بات کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ تنقید میری شاعری کی جگہ کبھی نہیں لے سکتی۔ میں بنیادی طور پر تخلیق کار ہوں اور چاہتا ہوں کہ صرف اسی حوالے سے ادبی تذکروں میں شامل رہوں۔ درس و تدریس سے وابستہ بہت سے تخلیقی فن کاروں کی شناخت نقاد کی حیثیت سے قائم ہوتی چلی جاتی ہے، اور حیرت ہوتی ہے کہ وہ تخلیق کار کے بجائے نقاد کہلانے میں ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔ تنقیدی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور تخلیقی شناخت کو پس پشت ڈالنے میں انھیں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ میں جب اس صورت حال کا تجزیہ کرتا ہوں تو ذاتی طور پر مجھے سخت وحشت ہوتی ہے۔ یہاں میں بہ بانگِ دہل کہنا چاہوں گا کہ جب کبھی بھی میری شعری شناخت پر تنقیدی شناخت حاوی ہوئی، میں اسی لمحے تنقید سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کر لوں گا۔ جب مجھے دوسروں کو اپنی گفتگو میں شریک کرنا ہوتا ہے تو میں تنقید کا سہارا لیتا ہوں، لیکن جب میں اپنے باطن میں جھانکتا ہوں اور خود سے باتیں کرنے کی خواہش ہوتی ہے تو صرف اور صرف شاعری ہی مجھے سہارا دیتی ہے۔ انسان دنیا سے کتنا بھی لاتعلق ہو جائے، اپنے آپ سے کبھی بے گانہ نہیں ہو سکتا۔ شاعری مجھے اپنے آپ سے ملنے

کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ لہٰذا مجھے یقین ہے کہ شاعری سے میری جذباتی وابستگی زندگی کے کسی بھی لمحے میں کم نہیں ہوگی۔

ہر فن کار بہت حساس ہوتا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اس کا ذہنی سکون درہم برہم کرسکتی ہے۔ معمولی سے معمولی واقعہ بھی اسے ریزہ ریزہ بکھرنے کے لیے مجبور کرسکتا ہے۔ وہ معمول سے ہٹ کر رونما ہو رہی چیزوں پر اپنا واضح یا خاموش ردِ عمل ظاہر کرتا ہے۔ وہ کسی بھی طرح بے حسی کا لبادہ نہیں اوڑھ سکتا۔ اگر وہ صحیح معنوں میں فن کار ہے تو اوروں کی طرح مصلحت پسندی سے کام نہیں لے سکتا۔ عملی طور پر نہ سہی وہ اپنی تخلیقات میں اس کا اظہار ضرور کرتا ہے۔ ذہنی انتشار جب عروج پہ ہوتا ہے تو عام طور پر دو طرح کی کیفیات سامنے آتی ہیں۔ پہلی صورت میں حساس فن کار تخلیق سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے اور پھر مزید ذہنی انتشار کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسے تخلیقی عمل سے گزرنے کے لیے ذہنی سکون کی ضرورت ہوتی ہے اور دن بہ دن پیچیدہ ہوتی جا رہی زندگی میں سکون کے لمحے عنقا ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں تخلیق کار کے ذہنی انتشار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ دوسری کیفیت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ذہنی انتشار کے عالم میں تخلیق کار کی نجات کا واحد ذریعہ خود اس کا تخلیقی عمل ہوتا ہے۔ وہ اطمینان اور سکون کی حالت میں اپنا تخلیقی عمل کامیابی کے ساتھ جاری نہیں رکھ پاتا، لیکن ذہنی انتشار کا معاملہ اسے تخلیقی سطح پر زیادہ فعال اور متحرک کر دیتا ہے۔ شعروادب کی تاریخ بھی اس بات کی گواہ رہی ہے کہ ذہنی طمانیت کے بجائے اندرونی انتشار نے زیادہ بہتر اور بامعنی تخلیقی فن پاروں کو جنم دیا ہے۔ خاکسار کا تخلیقی عمل اسی دوسری صورت سے وابستہ ہے۔ ذہنی انتشار کے عالم میں شاعری ہی مجھے سکون سے ہم کنار کرتی ہے۔ میں ذہنی طور پر جب کبھی بھی اذیتوں سے دوچار ہوتا ہوں، ریزہ ریزہ بکھرتے ہوئے اپنے وجود کو شاعری کے ذریعے ہی مجتمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایسی صورت میں شاعری کے علاوہ کوئی دوسری چیز میرے شب و روز کو معمول پر نہیں لاسکتی۔ سکون کے لمحوں میں کتابوں سے مجھے تقویت حاصل ہوتی ہے اور سکون کے لمحوں میں ہی میں تنقیدی کارروائیوں کا سلسلہ جاری رکھتا ہوں لیکن میری شاعری، سکون کے لمحوں میں کبھی وجود میں نہیں آسکتی، البتہ تخلیقی عمل سے گزرنے کے بعد ایک عجیب و غریب طمانیت میرا مقدر ہوتی ہے۔

مجھے اس اعتراف میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ اس قدرے مختلف مجموعے کو ترتیب دینے کا خیال مجھے وارث علوی کے ایک خط سے ہوا۔ ۱۴ر ستمبر ۲۰۰۷ء میں انھوں نے میرے پہلے مجموعۂ کلام ''شام ہوتے ہی'' سے متعلق چند سطریں لکھتے ہوئے اس بات کا خصوصی ذکر کیا تھا کہ ناصر کاظمی کے بعد خاکسار نے فطرت کے مظاہر کو سب سے زیادہ اپنی غزلوں میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ الحمد للہ میں خوش فہمی میں کبھی مبتلا نہیں ہوتا اور کسی بھی رائے کو منطقی اعتبار سے ذہن کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وارث علوی کی مبالغہ آمیز رائے نے مجھے وقتی طور پر نہال تو کیا لیکن ان کے جملے نے میرے اندر ایک تحریک ضرور پیدا کر دی کہ کوئی ایسا مجموعہ بھی ترتیب دیا جا سکتا ہے جس میں فطرت کے مختلف مظاہر، انسانی زندگی کے ناگزیر پہلوؤں سے وابستہ دکھائی دیں اور اس طرح فطرت کو قدرے مختلف تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ وارث علوی کو جب میں نے فون کے ذریعے اس مختلف مجموعے کی تیاری کے سلسلے میں بتایا تو انھوں نے حیرت انگیز دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ آئندہ ان سے جب بھی فون پر گفتگو ہوئی، وہ مجھے مسلسل ترغیب دلاتے رہے کہ اس مجموعے کو میں کسی طرح جلد از جلد مکمل کرلوں، لیکن ظاہر ہے یہ مشکل کام تھا جس میں شعوری عمل کا دخل کچھ زیادہ ہی تھا۔ تخلیقی عمل خاصا پیچیدہ عمل ہے جس میں معینہ اصول وضوابط بے معنی ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں ایک خاص موضوع کی پابندی کو پیش نگاہ رکھنا اور اسے تخلیقی سطح پر برتنے کی کوشش کرنا اور وہ بھی اس طرح کہ اس میں فطری بہاؤ کی کیفیت شامل ہو جائے، آسان نہیں۔ میں نے فطرت کے مظاہر کو غزل کی ردیفوں کے طور پر برتنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح نظموں کی تھیم کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام پہلوؤں کو منطقی ارتباط کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے تاکہ فطری مظاہر سے انسانی زندگی کے ناگزیر رشتوں کی وضاحت ہو سکے۔ مخصوص نوعیت کی غزلوں اور نظموں کی تخلیق کا خیال ۲۰۰۷ء کے بعد سے ہی میرے ذہن میں گردش کرتا رہا اور میں وقفے وقفے سے اس نوع کی غزلوں اور نظموں کو اپنی تخلیقی ترجیحات میں شامل کرتا رہا۔ منتخب اور معیاری رسائل میں جب بعض غزلوں اور نظموں کی اشاعت کے بعد شائقینِ ادب نے انھیں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تو مزید تقویت ملی، اور اب جا کر فطری مظاہر اور انسانی زندگی سے اس کے ناگزیر رشتوں کی

وضاحت، مجموعے کی شکل میں سامنے آپائی ہے۔ کاش وارث علوی اس مجموعے کو دیکھ پاتے۔ اس مجموعے کی تمام غزلیں اور نظمیں شعوری اور لاشعوری کیفیات کے امتزاج سے وجود میں آئی ہیں۔ اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کریں گے کہ ان غزلوں اور نظموں میں ذہن و دل کو متاثر کرنے والی خصوصیت کہاں تک پیدا ہو پائی ہے۔

ہوا کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کرۂ ارض کے گوشے گوشے میں ہوا اپنی موجودگی سے زندگی کی رمق بکھیرنے میں مصروف رہتی ہے۔ ہواؤں کا سرگم قدرتی مظاہر کو مخصوص رقص کے لیے مجبور کر دیتا ہے۔ جب ہوا گیت سناتی ہے تو پھر ہر شے اس نغمے کو سننے میں محو ہو جاتی ہے کہ اس کا حیرت انگیز سُر ہمیں اپنے ہی باطن سے پھوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ قارئین کرام ـــــ اگر دوڑتی بھاگتی زندگی میں ہوا کا دل فریب سنگیت اور مسحور کن گیت آپ کو بھی سنائی دے جائے تو مجھے محسوس ہوگا کہ قدرتی مظاہر سے انسانی رشتے کی ترسیل میں شاید میری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔

میں نے اپنے دونوں مجموعوں کو نقادوں کی بیساکھیوں سے آزاد رکھا، لیکن مجھے خوشی ہے کہ مجموعوں کی اشاعت کے بعد کتنے ہی لوگوں نے مضامین، تبصرے اور خطوط کی شکل میں اپنے بیش قیمتی خیالات تحریر فرمائے۔ تمام تحریروں کی اشاعت تو ممکن نہ تھی، البتہ میں نے کچھ منتخب لوگوں کی تحریروں کے منتخب حصوں کو اس مجموعے کے آخر میں شامل کر دیا ہے تاکہ مختلف لوگوں کی تنقیدی آرا بھی ایک جگہ محفوظ ہو جائیں۔

فکشن کے بادشاہ قاضی عبدالستار اور معتبر مابعد جدید نقاد شافع قدوائی کا شکریہ مجھ پر واجب ہے، جنھوں نے اپنے مخصوص انداز میں ایسی تحریر لکھی جو مجموعے کی غرض و غایت کو واضح انداز میں نشان زد کرتی ہے۔ برادرِ عزیز معید رشیدی کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں جنھوں نے بڑی محنت سے اس مجموعے کا سرورق تیار کیا۔

راشد انور راشدؔ
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

۲۸ر فروری 2015

غزلیں

○

ساتھ جب تیرے وہ آیا ہی نہیں وادیٔ گل
اب کسی رُت پہ بھروسہ ہی نہیں وادیٔ گل

لوگ خوشبو کی تجارت میں ہیں مصروف مگر
یہ ہنر ہم نے تو سیکھا ہی نہیں وادیٔ گل

اس علاقے میں بھی آ سکتی ہے پت جھڑ کی صدا
ہم نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں وادیٔ گل

لوگ آتے ہیں، چلے جاتے ہیں، لیکن اپنا
کوچ کرنے کا ارادہ ہی نہیں وادیٔ گل

چُھپ گیا ہے کسی کہسار میں سورج میرا
کتنے یُگ بیتے نکلتا ہی نہیں وادیٔ گل

صرف اک بار نظر آئی یہاں سبز پری
پھر کسی اور کو دیکھا ہی نہیں وادیٔ گل

اس نے اک بار بڑے پیار سے دیکھا تھا مجھے
کوئی منظر یہاں بدلا ہی نہیں وادیٔ گل

ہر گھڑی دھڑکا لگا رہتا ہے انہونی کا
دل بھی سینے میں دھڑکتا ہی نہیں وادیٔ گل

●

○

ذرا سی بات پہ آنگن کا کٹ گیا تھا درخت
تو سب نے خواب میں دیکھا کہ رو رہا تھا درخت

گئے زمانے کا قصہ نہیں یہ کل کی ہے بات
پرند گاتے تھے لوری، ہرا بھرا تھا درخت

اسی جزیرے کی کرنی ہے سیر ہم کو بھی
جہاں پہ خلقِ خدا چپ تھی بولتا تھا درخت

چہار سمت سے اب کاٹتا ہے جنگل کو
یہی قبیلہ کسی وقت پوجتا تھا درخت

نہ کر سکا وہ مسافر کا دل سے استقبال
خود اپنی چھاؤں سے محروم ہو چکا تھا درخت

وہ جس کا نام ہے گوتم، وہ کیوں نہیں آتا
ہر ایک یوگی سے ہر بار پوچھتا تھا درخت

میں شہر چھوڑ کے قصبے میں جب سے آیا تھا
بڑے ہی پیار سے مجھ کو نہارتا تھا درخت

بھری بہار میں شاخیں ہوئیں ہیں کیوں عریاں
خزاں میں دیکھا تھا ہم نے بہت گھنا تھا درخت

تو یہ ہوا کہ ہواؤں کی زد میں آ ہی گیا
سنبھلتا کیسے کہ کمزور ہو گیا تھا درخت

●

○

رنگ اب ہر پل بدلتا جا رہا ہے آسماں
اے زمیں والو سنبھل جاؤ خفا ہے آسماں

پاؤں کے نیچے سرکتی جا رہی ہے کوئی شے
سر کے اوپر دفعتاً کھونے لگا ہے آسماں

اس نے ان آنکھوں کو بوسہ دے دیا تھا خواب میں
اب کہاں کالی گھٹا، تاروں بھرا ہے آسماں

میری ہر کاوش پہ حیراں ہے نہ جانے کس لیے
ہر گھڑی پہلو بدل کر دیکھتا ہے آسماں

ریزہ ریزہ میں بکھرتا جا رہا ہوں ہر طرف
درد میرا دیکھ کر رونے لگا ہے آسماں

کون ہے زد میں کہ مصروفِ عبادت ہے زمیں
گڑگڑا کر کیوں دعائیں کر رہا ہے آسماں

چاندنی راتوں میں اس کا قرب حاصل تھا مگر
کوندتی ہیں بجلیاں اب چیختا ہے آسماں

یہ زمیں انجان ہے مجھ سے تو کوئی غم نہیں
مطمئن ہوں میں کہ مجھ کو جانتا ہے آسماں

آفتیں نازل نہ ہوں سب لوگ ہیں سہمے ہوئے
اتنا ہیبت ناک اب کیوں لگ رہا ہے آسماں

وہ ستاروں پر کمندیں ڈال کر محفوظ ہیں
خاک میں مجھ کو ملانے تُل گیا ہے آسماں

●

○

اڑتی رہتی تھی سدا خطۂ ویران میں خاک
آ گئی چپکے سے اب کے مرے دالان میں خاک

مطمئن تھا میں کہ آندھی کو تھمے عرصہ ہوا
غور سے دیکھا تو قابض تھی دل و جان میں خاک

خواہشیں چاک پہ رکھی ہیں کہ صورت اُبھرے
گرد کے ساتھ ملی ہے مرے ارمان میں خاک

جس کو بھی دیکھو وہ بدحال نظر آتا ہے
اب تو داخل ہوئی انسان کے ایمان میں خاک

بھاگتی دوڑتی دنیا میں کسے فرصت ہے
جمتی جاتی ہے یہاں میرؔ کے دیوان میں خاک

جانے کیا گزرے گا اب قیس پہ اللہ جانے
ریت صحرا میں نہیں اور نہ بیابان میں خاک

●

O

اب تو پینا ہے اسی حور کے در کا پانی
کردیا جس نے ہزاروں کا کلیجہ پانی

عشق کی آب و ہوا بھائی طبیعت کو بہت
مل گیا شہر میں دیوانے کو دانہ پانی

کاش معصوم صفت لوگوں کو معلوم تو ہو
تو نے کاٹا تو کسی نے بھی نہ مانگا پانی

بسترِ مرگ پہ ہیں تیری محبت کے مریض
تو پلادے انھیں نظروں کا ذرا سا پانی

پانی پانی وہ ہوا دیکھ کے مجھ کو لیکن
میں نے بروقت ستم گر کو پلایا پانی

ڈھونڈھ لیں سب کوئی محفوظ ٹھکانا، ورنہ
کچھ نہ کر پائیں گے بستی میں جو آیا پانی

ذائقہ کیوں ہے الگ، اب یہ سمجھ میں آیا
بدلی تھی آب و ہوا اس لیے بدلا پانی

تم تو کہتے تھے کہ اب سوکھ گئی ہے وہ ندی
سخت موسم میں بھی ہے یاں تو غضب کا پانی

جانے کیا سوجھا اسے، جوش میں آیا بادل
پھر تو یہ حال ہوا ٹوٹ کے برسا پانی

ترک اب کیسے کروں شعر و سخن کی دنیا
راس آنے لگا ہے مجھ کو یہاں کا پانی

●

○

کیا کوئی یاد ترے دل کو دکھاتی ہے ہوا
سرد سناٹے میں کیوں شور مچاتی ہے ہوا

یہ خبر دی ہے پرندوں نے چلو سنتے ہیں
جھیل کے پاس کوئی گیت سناتی ہے ہوا

باغ مرجھائے، چمن رویا، ہوئے دشت اُداس
سب کو مایوس کہاں چھوڑ کے جاتی ہے ہوا

خوشبوؤ آؤ، ٹھہر جاؤ ہمارے آنگن
پھر اشاروں میں بہاروں کو بلاتی ہے ہوا

جو گیا، لوٹ کے آیا ہی نہیں سرحد سے
اب کسے دشت میں آواز لگاتی ہے ہوا

جھنڈ میں لوٹنے لگتے ہیں سنہرے پنچھی
سوکھتی شاخوں پہ جب پھول کھلاتی ہے ہوا

خیر مقدم کے لیے بند دریچے کھولو
ناز و انداز سے، کس شان سے آتی ہے ہوا

●

○

یوں نہ بیگانہ رہو، گیت سناتی ہے ہوا
دل کی سرگوشی سنو، گیت سناتی ہے ہوا

زندگی ساز ہے، اس ساز پہ نغمے چھیڑو
تم بھی کچھ خواب بنو، گیت سناتی ہے ہوا

رات کے پچھلے پہر، خواب لبادہ تج کر
آج تم خود سے ملو، گیت سناتی ہے ہوا

راہ میں آئیں گی چٹانیں بہت سی لیکن
موج کے ساتھ بہو، گیت سناتی ہے ہوا

شب کے ساحل پہ کئی جگنو دکھائی دیں گے
کوئی غمگین نہ ہو، گیت سناتی ہے ہوا

ایسی چاہت میں نہیں کوئی قباحت لیکن
اپنا بھی دھیان رکھو، گیت سناتی ہے ہوا

خوشبوؤں کو کوئی تقسیم کہاں کر پایا
سرحدیں توڑ بھی دو، گیت سناتی ہے ہوا

منزلیں بڑھ کے ترے قدموں کا بوسہ لیں گی
یہ سفر طے تو کرو، گیت سناتی ہے ہوا

تھک کے جو بیٹھے تو ٹولی سے بچھڑ جاؤ گے
آگے ہی بڑھتے چلو، گیت سناتی ہے ہوا

●

○

رحم کر، اب تو بدل دے چال، بر فیلی ہوا
زندگی ہونے لگی بدحال، بر فیلی ہوا

بدحواسی کو تری اک دن سبق سکھاؤں گا
گر مرے ہاتھوں میں آئی ڈھال بر فیلی ہوا

وہ بھی زد میں آگئے جن کے پروں میں نور تھا
تو نے یہ کیسا بچھایا جال، بر فیلی ہوا

سوکھتی شاخیں صدائیں دے رہی ہیں ہر طرف
کر انھیں سبزے سے مالامال بر فیلی ہوا

دھوپ سے جھلسے بدن کو کچھ تو راحت مل سکے
گرم خطوں میں ہی ڈیرا ڈال برفیلی ہوا

وادیاں کرنوں کی آمد سے بہت مسرور ہیں
کچھ بتا تُو اپنے دل کا حال برفیلی ہوا

ایک چوٹی جو کہ تھی اُجلی قبا پہنے ہوئے
کیوں دکھائی دے رہی ہے لال، برفیلی ہوا

●

○

سہمی سہمی دل کی زمیں ہے، چلنے لگی ہے گرم ہوا
کوئی بھی اب محفوظ نہیں ہے، چلنے لگی ہے گرم ہوا

پھول سے چہرے خواب ہوئے ہیں، خاک بدن میں اڑتی ہے
جھلسی ہوئی ہر ماہ جبیں ہے، چلنے لگی ہے گرم ہوا

جلتے سورج نے دنیا کی ہر شے کو تاراج کیا
دریا بھی اب زیرِ نگیں ہے، چلنے لگی ہے گرم ہوا

خوف زدہ ہے ساری دنیا، جانے کیا آفت آئے
بے پروا اک خاک نشیں ہے، چلنے لگی ہے گرم ہوا

کھلی فضا میں زہر گھلا ہے، آخر کوئی کہاں جائے
آگ کا گولا زیرِ زمیں ہے، چلنے لگی ہے گرم ہوا

لوگ مکانیں خالی کر کے کب کے لوٹ چکے لیکن
اب بھی یہاں پہ کوئی مکیں ہے، چلنے لگی ہے گرم ہوا

●

○

سکوت ٹوٹا پگھلنے لگی پہاڑ کی برف
پھر آبشار میں ڈھلنے لگی پہاڑ کی برف

بدن جزیرے کی چنگاریوں سے تنگ آ کر
وہ اپنے جسم پہ ملنے لگی پہاڑ کی برف

حسین خواب کی تعبیر دیکھ لی جب سے
حدوں سے اپنے نکلنے لگی پہاڑ کی برف

اداس چہروں پہ چھانے لگی تھی قوسِ قزح
غضب کا رنگ بدلنے لگی پہاڑ کی برف

پرند گانے لگے، لوریاں سنانے لگے
ہوا کی گود میں پلنے لگی پہاڑ کی برف

نہ کوئی آندھی، نہ طوفان، پھر یہ کون آیا
کہ آہٹوں سے دہلنے لگی پہاڑ کی برف

تمام آب و ہوا پل میں ہوگئی تبدیل
یہ کس کو دیکھ مچلنے لگی پہاڑ کی برف

گلے جو ملنے سمندر سے ایک دریا چلا
تو اس کے ساتھ ہی چلنے لگی پہاڑ کی برف

●

O

سفر میں اب کے ہوا اطمینان، ریگستان
سنائی دیتی ہے مجھ کو اذان، ریگستان

ہوا کی ضدا ہے کہ تجھ کو تباہ کر دے گی
دکھا دے اپنی انا، آن بان، ریگستان

سلگتی ریت میں ہی تربیت جنوں کی ہوئی
یہی تو ہے مری وحشت کی شان، ریگستان

کسی طرح سے اگر آگیا سمندر بھی
مٹا نہ پائے گا میرا نشان، ریگستان

کوئی بھی رُت ہو، نتیجہ نہیں نکلتا ہے
میں دے رہا ہوں عجب امتحان، ریگستان

ہرے بھرے جو علاقے تھے، ہیں سرِ فہرست
ادا ہے کرنا تجھے بھی لگان، ریگستان

تو ہر نگاہ میں، ہر دل میں ہے، مگر کب سے
تری تلاش میں ہے اک جہان، ریگستان

وہ ٹولی روندنے نکلی ہے تیری وسعت کو
کہ اب سنبھال لے تیر اور کمان، ریگستان

میں ڈھونڈھتا ہوں کہ پھر کھو گیا ہے برسوں سے
یہیں کہیں پہ مرا خاندان، ریگستان

زمین والو، برا وقت آنے والا ہے
دکھائی دیتا ہے اب آسمان، ریگستان

اگر وجود کی وادی بھی ہوگئی معدوم
تو سوچ لینا ہے وہم اور گمان، ریگستان

جو میرا دل تھا، وہ ہے سنگ دل کے قبضے میں
نثار کرتا ہوں تجھ پر یہ جان، ریگستان

●

○

اپنی ہی روشنی میں نکھرنے لگا ہے چاند
کس کا خیال آیا سنورنے لگا ہے چاند

کچھ بھی ہو اب تو شام کو ڈھلنا نہیں مجھے
سورج کے اس بیان سے ڈرنے لگا ہے چاند

پہلے تو زندگی کی عبادت عزیز تھی
یہ کیا ہوا کہ قسطوں میں مرنے لگا ہے چاند

آنے لگا ہے تیزی سے بدلاؤ ہر طرف
ایسی ہوا چلی کہ بکھرنے لگا ہے چاند

کچھ بدلیوں کے ساتھ وہ سازش میں تھا شریک
ناراض اب ستاروں کو کرنے لگا ہے چاند

جادوئے عشق کا ہی اثر ہے، کسی کو دیکھ
آہستگی سے آہ بھی بھرنے لگا ہے چاند

●

○

جھیل کے شفاف پانی میں نہائی چاندنی
رات گھبرائی، ہوئی کچھ اور اُجلی چاندنی

تھا اماوس کی اندھیری رات کا چرچا مگر
سب نے دیکھا چارسو بکھری ہوئی تھی چاندنی

جاننا سب چاہتے تھے، جانتا کوئی نہ تھا
نام اس کا میں نے جب پوچھا تو بولی 'چاندنی'

صبح کے دو چار پنچھی اس کا جلوہ دیکھتے
کاش پو پھٹنے پہ بھی کچھ دیر رکتی چاندنی

تا کہ ہر شے میں نمایاں ہو سکے اس کا ہی نور
پھر کسی نے اپنے آنچل میں چھپا لی چاندنی

چاند میرے آج تم ناراض کیسے ہو گئے
میری خاموشی سے اُکتا کر یہ بولی چاندنی

ایک تارے نے کیا تھا باغ میں آنے کا عزم
اور استقبال میں گل نے بچھائی چاندنی

تم کبھی فرصت سے آنا، گل مہر کے سائے میں
بیٹھ کر باتیں کریں گے مجھ سے بولی چاندنی

مسکراہٹ کی نئی کرنوں سے رشتہ رکھ بحال
تیرے چہرے پر نہیں سجتی اداسی چاندنی

میں نے اپنے آپ کو جب قید گھر میں کر لیا
پھر تو مجھ سے خوب اُلجھی، خوب جھگڑی چاندنی

●

O

دم لینے کچھ دیر رکی تھی خواہش کی البیلی چھاؤں
کرنوں کے قدموں کی آہٹ پا کر سرپٹ بھاگی چھاؤں

پہلے وہ معصوم بہت تھی، شرماتی تھی، لیکن اب
دھوپ سرائے میں قابض تھی چنچل شوخ گھنیری چھاؤں

قدرت کے رنگین نظارے دیکھ رہے ہیں حیرت سے
پربت پربت کھیل رہی ہے دھوپ سے آنکھ مچولی چھاؤں

ایسا کیوں لگتا ہے اس سے جنم جنم کا ناطہ ہے
جب بھی میں ناراض ہوا تو مجھ کو منانے آئی چھاؤں

خاموشی سے خواب شجر کے پاس کسی دن آجاؤ
تم نے کہیں بھی دیکھی نہ ہوگی اب تک ایسی انوکھی چھاؤں

شیدائی بھی رہ جاتے محروم سریلے نغموں سے
شکر ترا اے وقتِ جدائی کچھ تو لبوں سے بولی چھاؤں

دلکش وادی، جھیل، پہاڑی، مجھ کو لبھاتی ہے لیکن
سب سے زیادہ راحت بخش ہے میرے لیے زلفوں کی چھاؤں

●

○

سنا کہ خوب ہے اس کے دیار کا موسم
دلوں پہ چھانے لگا پھر خمار کا موسم

کبھی کبھی تو بدن کو پتہ نہیں چلتا
کہ باغِ روح میں کب آیا پیار کا موسم

میں اس گلاب کو ناراض کر نہیں سکتا
بھلے ہی روٹھ کے جائے بہار کا موسم

یہ خوف دل میں اُبھرتا ہے درد کی صورت
بدل نہ جائے کہیں اعتبار کا موسم

میں خود بھی ملنے کو بے چین ہوں یہ جب سے سنا
مری تلاش میں ہے انتظار کا موسم

تمام آب و ہوا میں گلال بکھرا ہے
کہ رنگ لایا ہے اس کے نکھار کا موسم

کھلے ہوئے ہیں امیدوں کے پھول دل میں مگر
گزر نہ جائے کہیں انتظار کا موسم

بڑے مزے سے ابھی تک گزر رہے ہیں دن
اسی طرح رہے قائم خمار کا موسم

یہاں کبھی بھی خزاں کا گزر نہیں ہوگا
یہاں ہمیشہ رہے گا بہار کا موسم

سکونِ قلب میسر ہو، خواب پورے ہوں
کبھی تو آئے دلِ بے قرار کا موسم

کسی طرح بھی نہ انکار کی ہے گنجائش
کہ ہے عروج پہ قول و قرار کا موسم

وہ اچھے اچھوں کو خاطر میں اب نہ لاتا ہے
کہ ان دنوں تو ہے اس کے نکھار کا موسم

●

○

کڑے سفر میں ہوا گم وجود کا پتھر
ہوائے دشت مرے جسم کو بنا پتھر

میں اس کی ذات کو منزل کو شمار کرتا ہوں
مجھے سمجھتا ہے وہ اپنی راہ کا پتھر

یہ واقعہ ہے مگر میں بیان کیسے کروں
مرے ہی سائے نے مجھ پر اُٹھا لیا پتھر

نہ جانے کون سی تاثیر ہے ان آنکھوں میں
کہ جس نے غور سے دیکھا مجھے، ہوا پتھر

اسے پتہ ہے مری شخصیت تھی موم صفت
ستم کی آگ نے لیکن بنا دیا پتھر

ہے لین دین میں مشاق وہ بہت لیکن
جو میں نے پھول دیے، کیوں تھما دیا پتھر

کوئی بھی کام کا ہتھیار اب تو پاس نہیں
پلٹ کے دینا ہے مجھ کو جواب، لا پتھر

●

○

اس بدن صحرا میں اب کے تیری سی لگتی ہے دھوپ
یہ علاقہ کون سا ہے چھاؤں بھی لگتی ہے دھوپ

موت کے سوداگروں نے بھی کیا ہے اعتراف
منجمد ہر شے جہاں ہو، زندگی لگتی ہے دھوپ

اک طرف اس کی اذیت سے میں ہوتا ہوں نڈھال
اور کبھی پھر یوں بھی ہوتا ہے بھلی لگتی ہے دھوپ

کوئی سرگوشی نہیں، ساری فضا خاموش ہے
آج کسی کی یاد میں، کھوئی ہوئی لگتی ہے دھوپ

ایک دھندلا عکس روشن ہو رہا ہے ہر طرف
اس گھڑی تو کہکشاں کی پالکی لگتی ہے دھوپ

تم اندھیروں کے مسافر تھے، یہاں کیوں آ گئے
اب شکایت کر رہے ہو، اجنبی لگتی ہے دھوپ

●

○

سیلن زدہ سی دیواروں کو راحت پہنچائے گی دھوپ
سب کھڑکی دروازے کھولو کمرے میں آئے گی دھوپ

ابھی نظاروں نے بس اس کی خاموشی ہی دیکھی ہے
بادل جب انگڑائی لے گا، چھپ کے شرمائے گی دھوپ

اب بھی وقت ہے اپنے اندر اس کی تمازت کو بھرلو
ورنہ اگلے پل نظروں سے اوجھل ہو جائے گی دھوپ

پیڑ سلامت رہیں گے جب تک، سفر میں آسانی ہو گی
جب یہ سہارا چھنا تو پھر انگارے برسائے گی دھوپ

بوندوں کی خوش رنگ پھواروں کے البیلے منظر میں
کچھ لمحے امبر میں اپنی جھلک بھی دکھلائے گی دھوپ

عالی شان عمارت والے تو رہ جائیں گے محروم
در بدحال سی دنیا پر سونا بکھرائے گی دھوپ

●

○

تنہائیوں کو ڈستی ہے یہ فاصلوں کی رات
کچھ اس سے دل خراش نہ ہوگی غموں کی رات

ہر لمحہ انجذاب میں اللہ ہو کا ورد
ہے کتنی باوقار نئے سرمدوں کی رات

بے چینیاں عروج پہ ہیں، دل ہے مضطرب
کس طرح جانے گزرے گی ان دل جلوں کی رات

حملے کا خوف طاری ہے، سہمے ہوئے ہیں لوگ
مانگو دعائیں خیر سے گزرے سبھی کی رات

گزرے تو کسبِ نور کرے میرا قافلہ
خیموں میں جم کے بیٹھی ہے کیوں الجھنوں کی رات

بس چند ہم خیال ہوں پھر پوچھنا ہی کیا
سنتے سناتے کٹتی ہے ہم شاعروں کی رات

●

○

ہم دونوں کمرے کے اندر باہر تھی طوفانی رات
اب ایسے میں کیا بتلائیں کتنے جتن سے کاٹی رات

رہتی ہے بے تاب مجھے اپنی بانہوں میں لینے کو
جسم تھکن سے چور ہوا جب، وقت سے پہلے آئی رات

ہجر کی وحشت کا اندازہ کر پانا بھی مشکل ہے
اس کے لیے جس نے قسمت سے پائی وصل کی لمبی رات

محبوبہ کی صورت اس نے میرے آنسو پونچھے ہیں
کیا تم کو بھی ملی ہے ایسی غم کو بانٹنے والی رات

دل کا دیا بھی بجھنے لگا ہے تیز ہوا کے جھونکے سے
لیکن،ہم نے ساتھ گزاری خوب مزے سے اندھیری رات

اپنی تاریکی پہ، تنہائی پہ، اترائی، لیکن
اک لمحے کو مجھ سے بچھڑ کے ہوگئی کتنی اکیلی رات

نیند آنکھوں سے روٹھ چکی تھی، جاگ رہی تھی وہ بستی
لیکن سب کو خود میں سمیٹے گہری نیند میں سوئی رات

شور سے، ہنگاموں کے شکنجوں سے آزاد نہ ہو پاتے
مالک ہے احسان ترا کہ شام کے بعد آئے گی رات

●

○

یہ تو روشنی کی ہے چال شب
میں نشے میں ہوں تو سنبھال شب

دکھا پھر کوئی نیا معجزہ
ہوا روشنی کا زوال شب

مرا ہو کے بھی وہ نہیں ہوا
مجھے کیوں ہو اس کا ملال شب

غمِ زندگی سے میں ڈر گیا
یہ خیال دل سے نکال شب

مجھے اپنے پہلو میں دے جگہ
کبھی رکھ مرا بھی خیال شب

●

O

جدھر سے آئی تھی آہٹ ادھر گئی تھی زمین
مگر نظارہ جو دیکھا تو ڈر گئی تھی زمین

کچھ عرصہ پہلے یہاں کھیت لہلہاتے تھے
اور اب جو دیکھا مکانوں سے بھر گئی تھی زمین

عجیب دُھن تھی اسے آسماں سے ملنے کی
ہر ایک ذرّے نے روکا مگر گئی تھی زمین

ہوائے تازہ نے جب پھول کھلائے ہر سو
تو کھل اُٹھی تھی خوشی سے، سنور گئی تھی زمین

فضا نے وعظ و نصیحت کا باب کھولا تھا
اُٹھی وہاں سے تو لے کر اثر گئی تھی زمین

اسے کٹاؤ کے زخموں سے ہول آتا تھا
تو کیسے دریا میں اب کے اتر گئی تھی زمین

●

○

تھی اداسی ہر طرف اب گنگناتی ہے زمیں
یہ فلک سے کون آیا جگمگاتی ہے زمیں

ایک عرصے بعد اب سیراب ہوگی تشنگی
مہرباں ہیں کالے بادل اور نہاتی ہے زمیں

جو خلاؤں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں ہر طرف
ان کو سینے سے لگانے کو بلاتی ہے زمیں

ہے مصیبت کی گھڑی کوئی نہ اپنے ساتھ ہے
بے بسی پہ میری اب آنسو بہاتی ہے زمیں

ہم سبھوں نے جو بھی دیکھا اک طلسمی خواب تھا
دیکھنا ہے اور کیا منظر دکھاتی ہے زمیں

دور تک پھیلے ہوئے ہیں وسعتوں کے سلسلے
اب کہاں اپنی نگاہوں میں سماتی ہے زمیں

ان فضاؤں پر مسلط ہے عجب خوف و ہراس
ہے بہت کچھ ہونے والا تھرتھراتی ہے زمیں

●

○

کھلتے دیکھے تھے کبھی یار کے ہونٹوں کے گلاب
آج بھی تازہ ہیں ان آنکھوں میں خوابوں کے گلاب

ان کی شادابی ہر اک رُت میں رہے گی قائم
غم کے باغیچے میں سرشار ہیں زخموں کے گلاب

پھول جھڑنے کے بہت دعوے سنے تھے لیکن
اب ہوا کیا کہ مہکتے نہیں باتوں کے گلاب

ڈائری دل کی سجاتے ہوئے آیا نہ خیال
سوکھ جائیں گے بہت جلد ہی دونوں کے گلاب

وقت کی دھوپ میں یہ کیسی تپش آنے لگی
اب تو مرجھائے چلے جاتے ہیں یادوں کے گلاب

ہم تو اس شہر میں بس ایک مسافر ٹھہرے
دے گیا کون ہمیں اجنبی ناموں کے گلاب

رقص جاری ہے امنگوں کا دیارِ دل میں
اب بھی محفوظ ہیں خوش رنگ خیالوں کے گلاب

آسماں پر ہے دماغ ان کا تو حیرت کیسی
گالوں میں کھلنے لگے زہرہ جمالوں کے گلاب

یہ الگ بات کہ راہوں میں ہیں کانٹے لیکن
ہم تو اب تک ہیں سنبھالے ہوئے وعدوں کے گلاب

●

○

چہرہ تھا اس کا جیسے کہ کھلتا ہوا گلاب
لیکن وہ بدنصیب بدلتا رہا گلاب

مدت کے بعد آیا جو میں باغ کی طرف
مجھ پر نگاہ پڑتے ہی شرما گیا گلاب

دل چاہتا ہے گر تو سلیقے سے پیش کر
کرتا نہیں قبول میں پھینکا ہوا گلاب

موسم کے رنگ و روپ بدلتے گئے مگر
میں اس کے باوجود بھی دیتا رہا گلاب

پہلے تو اجنبی کا سا برتاؤ تھا، مگر
اب کے بڑے تپاک سے مجھ سے ملا گلاب

کانٹے بھی اس کی راہ میں مجھ کو نہ مل سکے
میں اس کے باوجود بھی دیتا رہا گلاب

●

○

راز بلندی پستی کا سمجھائے پھول
دھیرے دھیرے کھل کر جب مرجھائے پھول

اس نے بھاری پتھر پھینکا تھا لیکن
کرتب دیکھو میری جانب آئے پھول

بلبل کو کافی تکلیف پہنچتی ہے
وہی کہانی پھر سے جب دہرائے پھول

کلیوں کی رنگت میں آئی تبدیلی
بھونرے کی باتوں کو سن شرمائے پھول

اپنے قدموں میں کچھ ایسا جادو ہے
پلک جھپکتے انگارہ بن جائے پھول

گاؤں کی آنکھیں شہر میں آ کے حیراں ہیں
نہیں کسی جوڑے میں اب لہرائے پھول

بے دردی سے موسم نے جھلسایا ہے
شاید ہی ان شاخوں میں اب آئے پھول

کانٹے بچھانا کل تک جس کا شیوہ تھا
آج مری راہوں میں وہ برسائے پھول

●

○

دھوئیں کے تار سا اب کے اٹھا ہے گرد و غبار
ہر ایک چہرے پہ جمنے لگا ہے گرد و غبار

بدل کے بھیس ہوا کا ہے قافلے میں شریک
کسی کے روکے سے کب رُک سکا ہے گرد و غبار

ہر ایک شے ہے نظر کی گرفت سے باہر
چہار سمت ہی پھیلا ہوا ہے گرد و غبار

اب اس علاقے میں سبزے کی فکر لا حاصل
یہاں تو برسوں سے اڑتا رہا ہے گرد و غبار

نہ جانے قصبے میں کیا کچھ ہوا تھا رات گئے
نگہ میں خواب کے بدلے بسا ہے گرد و غبار

ضرور ہوتا ہے خوشبوئے یار کا دھوکا
کوئی دوانہ کہیں چومتا ہے گرد و غبار

کھلی نہ ایک بھی کھڑکی تو پھر یہ کیسے ہوا
تمام کمرے میں بکھرا پڑا ہے گرد و غبار

●

O

داوَ غضب کا کھیلی گرد
ہر سو رنگ رنگیلی گرد

جمنے لگی دل شیشے میں
خواہش کی چمکیلی گرد

جھونک دی میری آنکھوں میں
ظالم نے اک مٹھی گرد

مان لے مجھ کو بنجارن
بنجارے سے بولی گرد

اس جیون کے کتنے روپ
پانی، پتھر، مٹی، گرد

ریت کے ڈھیر پہ بیٹھے ہو
ہوا چلی تو اڑے گی گرد

منظر دُھندلا دھندلا ہے
پس منظر میں گرد ہی گرد

●

○

ریت قابض تھی، بہت خاموش لگتی تھی ندی
پار کرتے وقت یہ جانا کہ گہری تھی ندی

جس جگہ اب ہے گھنی آبادیوں کا سلسلہ
کل اسی قصبے کے بیچوں بیچ بہتی تھی ندی

ایک ہیبت ناک منظر دل کو دہلاتا ہوا
راستہ اپنا اچانک پھر سے بدلی تھی ندی

اس کے اندر کی خموشی میں غضب کا راز تھا
اپنے اک مخصوص لے میں گنگناتی تھی ندی

مل کے لہروں سے بھی سنگم کو ترستی ہی رہی
اس سفر میں ایسا لگتا ہے اکیلی تھی ندی

دیکھ قدموں کی تھکن وہ روکتی اپنا بہاؤ
اور میرے اک اشارے پر ہی چلتی تھی ندی

یہ بھرم تھا سو رہی ہے وہ بھنور آغوش میں
ڈوبنے کی آگئی نوبت کہ جاگی تھی ندی

اب بڑی ہوکر سمندر کی طرح لگنے لگی
چند برسوں پہلے دیکھا تو چھوٹی تھی ندی

پُل شکستہ تھا مگر سیاح تو بے خوف تھے
گرمیوں کے دن تھے، چاروں سمت سوکھی تھی ندی

●

○

نئے زمانے کا فرہاد بھی نرالا ہے
نکل رہی ہے پہاڑوں سے ایک خوں کی ندی

تلاش آج بھی جاری ہے، پر نہیں ملتی
نہ جانے کون سی دنیا میں ہے سکوں کی ندی

سبھی نے فتح کیا باہری سمندر کو
کوئی تو پار نہ کر پایا اندروں کی ندی

تباہیوں کو تصور کی آنکھ سے دیکھو
اُٹھان پر ہے بہر گام اک جنوں کی ندی

بلا کی گرمی ہے اس سال ایسا لگتا ہے
کہ سوکھ جائے گی اب کے مرے فسوں کی ندی

●

○

اگرچہ میرے سفینے سے تھا خفا دریا
مگر ڈبونے میں ناکام ہی رہا دریا

وہ خوف ناک سی موجیں تو بدگمان رہیں
مگر بڑھاتا رہا میرا حوصلہ دریا

میں بوند بوند کا پیاسا تھا اس نے دیکھ لیا
مرے قدم جو بڑھے ساتھ چل پڑا دریا

سبھی نے اپنے ارادوں میں نظرثانی کی
نظر کے سامنے حائل تھا آگ کا دریا

عصا نے اب کے کرشمہ عجیب دکھلایا
ذرا سی ضرب سے صحرا بھی بن گیا دریا

مقابلے میں تو بپھرا ہوا سمندر تھا
جو فتح یاب ہوا وہ تھا عشق کا دریا

جو متصل تھے علاقے وہ کیوں ہیں سوکھے ہوئے
اس اک سوال سے ناراض ہوگیا دریا

وہ عنقریب ہی خاموش ہونے والا ہے
بہا رہا ہے، بہانے دو، علم کا دریا

●

○

زندگی بھر جن کی آنکھوں نے نہیں دیکھا پہاڑ
کیا وہ جانیں کوہکن نے کس طرح کاٹا پہاڑ

تو معمّر ہے تو میری الجھنوں کو دور کر
خواب دیکھا روئی کی مانند اڑتا تھا پہاڑ

دن کے ذرّوں کو اکٹھا کرنے میں بدحال ہیں
ان سے پوچھا جائے کیسے کاٹیں گے شب کا پہاڑ

کیا پتہ کشتی کا کیا ہوتا، کہاں جاتے سبھی
خیر سے آیا نظر لہروں میں جودی کا پہاڑ

حوصلے کی پرورش میں ہی کہیں کچھ کھوٹ تھی
جب اکڑ اس نے دکھائی سامنے آیا پہاڑ

دُھن ہو پکّی تو نہیں ہوتا ہے مٹ جانے کا خوف
اس کا جلوہ دیکھنے کو چڑھ گیا موسیٰ پہاڑ

سنتے آئے تھے قبیلوں سے، خزانے دفن ہیں
اس تجسّس کا اثر تھا، ہم نے بھی کھودا پہاڑ

اپنا خطّہ ہے حفاظت میں دعاؤں کے طفیل
بڑھتے بڑھتے ہوگیا اب کس قدر اونچا پہاڑ

●

○

کچھ تو یہاں ہوا ہے سرِشام عندلیب
ہے صبح سے ہی باغ میں کہرام عندلیب

وہ ہنستے مسکراتے سے چہرے کہاں گئے
کیوں ہو گئے ہیں سونے در و بام عندلیب

کس گل کی ہے تلاش جو پھرتا ہے در بدر
تیرے لیے ضروری ہے آرام، عندلیب

قاصد ہے دستیاب کہاں، مرحلہ ہے سخت
تجھ کو ہی لے کے جانا ہے پیغام عندلیب

جائے اماں کہیں بھی نہیں، جائیں کس طرف
ہے انتشار اب تو سرِ عام عندلیب

صیاد کوئی اور ہی تھا، پر کھلا نہ بھید
بیکار میں ہم ہوگئے بدنام عندلیب

کوشش کے باوجود اجالا نہ مل سکا
قسمت میں تھی فسردہ سی اک شام عندلیب

دکھ سکھ میں تُو رہا ہے سدا میرا غم گسار
کرتا ہوں میں حیات ترے نام عندلیب

●

○

خاموش نہ رہ اپنی زباں کھول پرندے
سب سننے کو بے تاب ہیں کچھ بول پرندے

آہوں نے تری اس کا برا حشر کیا ہے
صیاد کے ہاتھوں میں ہے کشکول پرندے

دنیا ترے نغموں کی دوانی ہوئی لیکن
تو بھی ہے مرے واسطے انمول پرندے

ہے کون تری گھات میں اور کون محافظ
تو اچھا برا نظروں سے ہی تول پرندے

جس شاخ پہ تُو بیٹھے وہی تیرا نشیمن
آزاد فضاؤں میں تو اب ڈول پرندے

باغوں سے گزرتے ہوئے یاد آئی جو قربت
حسرت سے تجھے دیکھ ترا غول پرندے

مجھ کو ہے پتہ، تجھ کو نہیں چاہیے کچھ بھی
بس پیار ذرا، میٹھے سے دو بول پرندے

بے حس یہ زمانہ ہے ترے درد سے انجان
آواز میں اب غم کی کسک گھول پرندے

●

○

زندگی ریت بنی آیا غضب کا طوفان
لوگ ہیں خوف زدہ کیسے تھمے گا طوفان

کس کو معلوم پُراسرار بدن ہے اس کا
جس کی آنکھوں میں جذبات کا بپھرا طوفان

جانے کتنے ہی قبیلے تری زد میں آئے
اب تو کچھ بھی نہ بچا چھوڑ دے پیچھا طوفان

دیکھتے دیکھتے جنگل بھی بنے گا صحرا
اک نہ اک روز دکھائے گا تماشہ طوفان

سب کے ارمانوں کی دنیا ہوئی برباد مگر
پھر بھی بے چین ہے تُو، کیا ہے ارادہ طوفان

سوچنے والے کبھی غور نہیں کر پائے
جسم کی خیر نہیں، دل میں جو اٹھا طوفان

کشتیاں مل کے بنائیں کہ یہی بہتر ہے
اب نہ آئے گا کوئی نوح جو آیا طوفان

●

○

کیا ترے دل میں ہے اس بار سمایا سیلاب
ہر طرف چیختی پھرتی ہے رعایا سیلاب

جو کہ وادی سے ہیں وابستہ کہاں ان کو خبر
لوگ واقف ہی نہ تھے ہم نے دکھایا سیلاب

قرض ہے کیا کہ جو صدیوں سے ادا ہوتا نہیں
اب تو بتلا بھی دے کیا کچھ ہے بقایا سیلاب

سب کے ذہنوں میں ہے غرقابی کی دہشت طاری
اب کہاں جائے اماں ہر طرف آیا سیلاب

زندگی جن کے لیے آنکھ کا دھوکا ٹھہری
ان کے نزدیک بھلا کیوں نہ ہو مایا سیلاب

اب نکل بھاگنا چاہیں بھی تو ناممکن ہے
ایک موقع تھا مگر ہم نے گنوایا سیلاب

●

○

حقیقت میں جب گل کھلاتا ہے سبزہ
تو ویران آنکھوں میں آتا ہے سبزہ

تھے سب دیکھنے والے حیران ششدر
کہ صحرا میں اب لہلہاتا ہے سبزہ

جو شیدائی ہیں، آزماتا ہے ان کو
نئے داؤ ہر پل دکھاتا ہے سبزہ

یہ موسم کی برکت، یہ چاہت کی خوشبو
ہے دھن میں مگن، گنگناتا ہے سبزہ

یہ آنکھوں میں کیسی چمک آگئی ہے
ستاروں سا اب جھلملاتا ہے سبزہ

●

○

تجھ پہ مرکوز ہے دنیا کی نگہ، قوسِ قزح
اپنے کرتب تو دکھا، کھول گرہ، قوسِ قزح

جب ابھرتی ہے دھنک تیری جبیں پر اپنی
ہوتے ہیں چہرے حریفوں کے سیہ قوسِ قزح

چاہنے والوں سے غم بانٹ نئے موسم میں
کچھ تو نظروں سے بتا، اپنی بھی کہہ، قوسِ قزح

آسماں تیرے لیے تنگ ہوا تو غم کیا؟
شان سے اب فلکِ جان میں رہ، قوسِ قزح

موسموں کے جو ستم ہیں وہ عیاں ہوں سب پر
یوں ہی خاموشی سے اب ظلم نہ سہہ، قوسِ قزح

●

○

دل جزیرے میں تو خاموش تھی غم کی آندھی
شام ہوتے ہی مگر زور کی آئی آندھی

بے وجہ تم کو بھی خدشات نے بے چین کیا
اب تو ہر سمت ہی خاموشی ہے، کیسی آندھی

جس میں بکھراؤ کی لذت بھی سوا ہو جائے
کاش آ جائے ذرا دیر کو ایسی آندھی

نہ کہیں شور بلا کا، نہ کہیں گرد و غبار
دشتِ احساس میں چلتی ہے انوکھی آندھی

اب تو آ جائے گی ہر شے ہی فنا کی زد میں
ہائے تھمتی بھی نہیں کیسی ہے کالی آندھی

میں نے صحراؤں میں سبزے تو اُگائے لیکن
میرے اس کام سے ناراض رہے گی آندھی

●

○

گلشن میں ہوا کیا کہ ہیں سہمے ہوئے پتّے
ہر سمت ہیں قدموں سے روندے ہوئے پتّے

آتی ہے خزاں جب تو بدل جاتا ہے موسم
اب کے تو بہاروں میں ہی پیلے ہوئے پتّے

جنگل کی ہوا ساتھ اڑا لے گئی ورنہ
جاتے بھی کہاں شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتّے

ہیں خوف زدہ ایسے کہ سرگوشی ہوا کی
سنتے ہی لرز اٹھتے ہیں سوکھے ہوئے پتّے

پھوٹے جو کسی شاخ پہ کونپل تو خوشی ہو
اب دیکھے نہیں جاتے ہیں گرتے ہوئے پتے

جیسے ہی نئی رُت نے قدم باغ میں رکھا
بیدار ہوئے خواب سے سوئے ہوئے پتے

پیڑوں کی کہانی تو بیاں کچھ ہوئی لیکن
کچھ اور ہی کہتے رہے بھیگے ہوئے پتے

●

○

دُھند کی مات ہوئی شان سے نکلا سورج
مدتوں بعد مری آنکھوں نے دیکھا سورج

یہ خبر سن کے سبھی سر کو اُٹھائے ہیں کھڑے
نیلے امر پہ دکھائے گا تماشہ سورج

کالے بادل کی حکومت تھی ہر اک سمت مگر
دفعتاً ایسا ہوا آنکھوں میں چمکا سورج

جو کہ جھرمٹ میں ستاروں کے رہا کرتا ہے
کیا کبھی دیکھا ہے تم لوگوں نے ایسا سورج

اس کے بدلے ہوئے تیور سے یہی لگتا ہے
اب کے تاریکی بکھیرے گا سنہرا سورج

صرف جھلسا کے اسے چین نہیں آئے گا
جلد ہی آگ بھی برسائے گا تپتا سورج

کیا جہاں والو پہ آفت کوئی نازل ہوگی
کررہا کیوں ہے غضب ناک اشارہ سورج

●

○

فلک سے زمیں تک یوں آتی ہیں بوندیں
نئے سُر میں کچھ گنگناتی ہیں بوندیں

ہے چاروں طرف پھول موسم کا چرچا
سو اپنا بھی جلوہ دکھاتی ہیں بوندیں

جو بنجر زمیں تھی وہ گلشن بنی ہے
جسے دیکھ کر مسکراتی ہیں بوندیں

نہ مرجھانے دوں گا میں باغِ تمنا
مرا حوصلہ آزماتی ہیں بوندیں

کبھی جسم کو بخشتی ہیں یہ راحت
کبھی آگ دل میں لگاتی ہیں بوندیں

جن آنکھوں میں ہر پل عجب سی کشش تھی
ان آنکھوں میں اب آنسو لاتی ہیں بوندیں

وہاں رات میں جگمگاتا ہے سورج
یہاں خواب میں جھلملاتی ہیں بوندیں

ہوا اس قدر سرد ہونے لگی ہے
بدن جھیل میں کپکپاتی ہیں بوندیں

•

○

پتہ لگاؤ ہوا کس لیے خفا بادل
ذرا سی دیر برس کر کہاں گیا بادل

رہے گا جاری تمنا کے دشت میں کب تک
ترے بھٹکنے کا اس طرح سلسلہ بادل

مجھے جو پیاس سے بدحال اس نے دیکھ لیا
میرے لبوں کی نمی کے لیے رُکا بادل

اگر قبول کبھی کر لی دھوپ کی بیعت
تو پھر ہمیں بھی دکھائے گا آئینہ بادل

تری گرج سے سبھی خوف سے ہیں سہمے ہوئے
کہ تجھ پہ چھانے لگا کیسا یہ نشہ بادل

سمندروں سے نظر پھیر لے خدا کے لیے
اب اپنے خیموں کو صحراؤں میں لگا بادل

ہم ایسے تشنہ لبوں کے بھی غم میں شامل ہو
ملے جو وقت تو اپنی بھی کچھ سنا بادل

جہاں بھی جیسے بھی تو نے کماں سنبھالی ہے
کوئی بھی تجھ کو نہ پھر زیر کرسکا بادل

●

○

یونہی نہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے ریت
شاید کسی کی یاد میں کھوئی ہوئی ہے ریت

شاداب ہم لہو سے کریں گے اسے مگر
اپنے تمام وعدوں کو بھولی ہوئی ہے ریت

آہٹ کوئی بھی ہو تو وہ چونکے گی دفعتاً
سوئی ہوئی فضا ہے، پہ جاگی ہوئی ہے ریت

بادل کا اک ہجوم تھا، آیا، چلا گیا
اب تو چہار سمت ہی بھیگی ہوئی ہے ریت

ساحل پہ ہم گھروندے بناتے رہے مگر
ٹوٹا جو خواب دیکھا تو بکھری ہوئی ہے ریت

اب تو مقابلے کا ہُنر آگیا اسے
آندھی کے باوجود بھی ٹھہری ہوئی ہے ریت

دن میں بہت ستایا اسے آفتاب نے
مہتاب کے طفیل میں نکھری ہوئی ہے ریت

●

○

تیرے ہی دم سے وہ سر سبز ہوا بادِ صبا
کیسے احسان مگر بھول گیا، بادِ صبا

ہر طرف حبس کا عالم تھا، گھٹن بڑھتی گئی
بن ترے باغ میں بھی دل نہ لگا، بادِ صبا

اب بھی تنہائی میں افسوس بہت ہوتا ہے
وہ مرا ہو کے بھی میرا نہ ہوا، بادِ صبا

تو نے بھی صحرا سے اب جوڑ لیا ہے رشتہ
یہ خبر سن کے میں بے چین ہوا، بادِ صبا

تیرے تبدیل رویے سے یہ احساس ہوا
اب بھی جاری ہے تری گردشِ پا، بادِ صبا

سب کو امید تھی، لائے گی تو خوشیوں کی نوید
ہائے افسوس کہ مایوس کیا، بادِ صبا

●

○

آج پُرنور ہوا جو تھا اندھیرا رستہ
سب تذبذب میں رہے، ہم نے نکالا رستہ

اب کبھی لوٹ کے شاید وہ نہیں آئے گا
تھک گئی آنکھ مری دیکھ کے اس کا رستہ

کوئی بھولے سے ادھر آیا نہیں صدیوں سے
تم کو کس شخص نے بتلایا یہاں کا رستہ

کیا ہوا، کھو گیا دورانِ سفر، راہ نما
قافلہ ٹھہرا رہا، یاد نہ آیا رستہ

لوگ اپنے ہی تعاقب میں بھٹکتے رہتے
ایک امید تھی جس نے کہ دکھایا رستہ

پھر اُمنگوں نے اشاروں سے بلایا تھا اسے
گھر سے نکلا تھا کہ اک خوف نے روکا رستہ

جانے کس دُھن میں قدم بڑھتے چلے جاتے تھے
چل رہا تھا وہ مگر، بھول گیا تھا رستہ

خار اُگتے تھے جہاں، پھول کھلے ہیں ہر سو
کس سلیقے سے یہاں دل نے بنایا رستہ

سب تو بازار کی رونق میں ہیں مصروف مگر
میرے ہی حصے میں سنسان سا آیا رستہ

●

○

رِم جھم سی اس پھوار میں پہلے پہل نہائی صبح
جیسے وہ تازہ دم ہوئی، آنکھوں سے مسکرائی صبح

مل کر چلو منائیں گے سب لوگ جشنِ زندگی
مدت کے بعد ہی سہی حصے میں اپنے آئی صبح

بھونروں کے ساتھ پھول بھی یہ سوچنے میں غرق ہیں
کلیوں نے اتنے شوق سے کس کے لیے سجائی صبح

اپنے حصار میں لیے، تھا شامِ غم کا دھندلکا
لیکن خوشی کی بات ہے نظروں میں اب سمائی صبح

ہر شے یہاں اُداس ہے، منظر بھی ہے دھواں دھواں
گانے لگے گی کائنات، جیسے ہی گنگنائی صبح

دل کش سہانے خواب جو آنکھوں میں آئے دفعتاً
شب کے سفر میں دور سے دینے لگی دکھائی صبح

قسمت میں انتشار ہے، بدلے گا کچھ نہیں یہاں
تم نے خراب رات کی، میں نے بھی تو گنوائی صبح

●

○

آپ اپنی آگ میں جلنے لگی ہے دو پہر
کیا ہوا ہے ہاتھ کیوں ملنے لگی ہے دو پہر

چاہتا تھا دیکھ لوں میں بھی کرشمہ دھوپ کا
اب مگر کیسے کہوں کھلنے لگی ہے دو پہر

ضرب تو آندھی نے پہنچائی بہت، پھر کس طرح
اپنے زخمی پاؤں سے چلنے لگی ہے دو پہر

سانحہ کوئی ہوا ہے ورنہ یہ ممکن نہ تھا
شام کی مانند ہی ڈھلنے لگی ہے دو پہر

یہ نظارہ دیکھ کر خلقِ خدا حیران ہے
سہ پہر کی گود میں پلنے لگی ہے دو پہر

●

○

کیسے پتہ لگائیں کہاں کھوگئی ہے شام
شاید اندھیرے غار میں اب سوگئی ہے شام

دن تو گزر چکا ہے بھٹکنے میں در بدر
اچھا ہے گھر کو لوٹ چلیں ہوگئی ہے شام

سارے اُداس چہروں پہ آنے لگا نکھار
جو بھی غبارِ درد تھا سب دھوگئی ہے شام

اب انتظار خواب کی فصلوں کا ہے ہمیں
پلکوں میں سب کے نیند ہی تو بوگئی ہے شام

ہم جیسے بے بسوں کا سہارا ہے بس وہی
اس کو منالو، روٹھ کے دیکھو گئی ہے شام

امکان ہے نہ آنکھ میں آنسو بھی ہوں رواں
بدحالیوں پہ میری بہت رو گئی ہے شام

●

○

چل دیا چھوڑ کے وادی کو کہاں، آبِ رواں
کیسے ڈھونڈے گا کوئی تیرا نشاں، آبِ رواں

تیرے مخصوص ترانے کا اثر ہے شاید
گنگناتا ہے کوئی نغمۂ جاں، آبِ رواں

جن نگاہوں کو ابھی دید کی توفیق نہیں
ان کے ہی واسطے ہے وہم وگماں، آبِ رواں

یونہی خاموش سی لہروں میں نہ جاگی ہے چمک
تجھ میں اترا ہے کوئی نور فشاں، آبِ رواں

جانے کیا بات ہوئی، چشمہ رواں ہوتا نہیں
اب تو کہسار سے اُٹھتا ہے دھواں، آبِ رواں

سب کے چہروں پہ اُبھر آئی ہے دہشت کی لکیر
بدلا بدلا نظر آتا ہے سماں، آبِ رواں

جب کبھی پیاس ستائے گی کسی وحشی کو
بھاگتا بھاگتا آئے گا، یہاں آبِ رواں

●

○

کیا سے کیا ہوگیا گھنا جنگل
اپنی قسمت پہ رو پڑا جنگل

دل کی شادابیاں جو روٹھیں تو
سوکھ جائے گا جسم کا جنگل

تیرگی چار سمت قابض ہے
نور سے پھر بچھڑ گیا جنگل

شہر میں آ گیا ہوں چپکے سے
دے رہا ہے مجھے صدا جنگل

اے ہوا تو سبب بتا آخر
اتنا خاموش کیوں ہوا جنگل

میں نے صحرا نورد کو اک دن
سونپ ڈالا ہرا بھرا جنگل

●

○

بھٹک رہا ہے کوئی بے قرار اے جنگل
بچھڑنے والے کو تو بھی پکار اے جنگل

خدا کے واسطے جانے دے، کر رہا ہے کوئی
کئی یگوں سے مرا انتظار اے جنگل

نہ جائے کوئی بھی گلشن کی سمت، شور اٹھا
یہیں منائیں گے جشنِ بہار اے جنگل

جماعتوں کی جو وحشت اسے ستائے گی
پلٹ کے آئے گا بے اختیار اے جنگل

ذرا سا شعلہ ہی ابھرا تھا پھر تو اگلے پل
تمام پھیل گیا انتشار اے جنگل

اگر شکاری نہیں ہے تو کس لیے آخر
دکھائی دیتا ہے وہ بار بار اے جنگل

●

○

خواب کے بدلے ان آنکھوں میں سمائے تارے
اس کو پانا تھا سو ہم توڑ کے لائے تارے

یہ سیہ رات کسی کو بھی نہیں بخشے گی
اب جبینوں پہ کوئی بھی نہ سجائے تارے

جب کسی بات پہ پھر چاند سے رنجش پالی
مجھ کو سمجھانے مرے خواب میں آئے تارے

مطمئن سب ہیں کہ امبر پہ ہے تارا ان کا
کوئی تو مجھ کو بھی قسمت کے دکھائے تارے

اس نے معمولی سی اک بات پہ رشتہ توڑا
پھر تو ایسا ہوا دن میں نظر آئے تارے

تیرے آنے کی خبر سن کے میں حیران ہوا
گل کے بدلے تری راہوں میں بچھائے تارے

●

O

پربت پربت ڈھونڈھ لیا، صحرا صحرا
کہاں گیا میرا ہم زاد بتا صحرا

کچھ بھی نہ ہوگا اندر اندر گھٹنے سے
اس کو ہے پانا تو آواز لگا صحرا

اس بہانے اس کی وحشت کچھ کم ہو
خانہ بدوش کو اپنے پاس بلا صحرا

ہوا بھی تیرا ساتھ نبھائے گی ہر پل
کچھ تو اپنے تیور آج دکھا صحرا

پتھرائی جاتی ہیں چمکیلی آنکھیں
اپنی ہیبت ناکی اب تو چھپا صحرا

●

○

خیال وخواب ہیں دھندلے نظر میں تاریکی
اجالا کیسے ہو حاصل، سفر میں تاریکی

اسی حویلی کی رونق کے خوب چرچے تھے
اسی حویلی کے اب بام و در میں تاریکی

تو اس علاقے کو تاراج کر دیا کس نے
سسک رہے ہیں مناظر، نگر میں تاریکی

یہ آنے والے برے وقت کی نشانی ہے
دکھائی دیتی ہے شمس و قمر میں تاریکی

سفر میں نکلا تھا معقول انتظام کے بعد
مگر جو لوٹا تو پھیلی تھی گھر میں تاریکی

●

○

کسی طرح بھی مصیبت کو ٹال اے مٹی
ہوا سے پوچھ لے مشکل سوال اے مٹی

یہ میرا خاک بدن اب ترے حوالے ہے
یہ تیری ہی امانت سنبھال اے مٹی

خلاؤں میں ہے بھٹکنے کا سلسلہ جاری
عروجِ فن پہ ہے آیا زوال اے مٹی

ہر ایک شے کو ترے سانچے میں ہی ڈھلنا ہے
تری مثال تو ہے بے مثال اے مٹی

مری وجود کی چنگاریاں ہیں دفن مگر
مجھے نمو کی ہے خواہش، نکال اے مٹی

سبھی کو آنا ہے اک دن تری پناہوں میں
کسی بھی لمحے نہ آیا خیال اے مٹی

میں چاہتا ہوں کہ آنگن میں ڈھیروں پھول کھلیں
ہو تیری خاک سے رشتہ بحال اے مٹی

●

○

لہروں کو صدا دیتا ہے گم نام جزیرہ
تنہائی میں روتا ہے سرِ شام جزیرہ

یہ عقل سمجھ پائے گی کب اس کی حقیقت
قدرت کے تغیر کا ہے انجام جزیرہ

ہوتا ہے ہر اک لمحہ تباہی کا وہاں رقص
جائے نہ وہاں کوئی، ہے بدنام جزیرہ

بپھری ہوئی موجیں ہیں، سمندر سے بہر گام
ہے برسرِ پیکار، سرِعام، جزیرہ

وحشت زدہ سناٹوں کی سرگوشی بھی معدوم
آتا ہے نظر اب تو در و بام جزیرہ

●

○

تمام لوگ تھے خوش، دیکھ حال کی بارش
کوئی سمجھ نہ سکا ہے زوال کی بارش

نظر فریب نظارے بھی کھو چکے رنگت
کہ دل کو بھاتی ہے حسن و جمال کی بارش

غضب کا سوکھا پڑا تھا گزشتہ سال مگر
سبھی نے دیکھی ہے اب کے کمال کی بارش

عجیب خوف سمایا ہے دل میں جب سے سنا
جنوبی خطے میں آئی شمال کی بارش

حدِ نگاہ مضامینِ نو کے پھول کھلے
کہیں بھی تھمتی نہیں اب خیال کی بارش

●

○

وہ تھی موجِ جاوداں اس کا سراپا آبشار
اب فقط آنکھوں کو بھائے، جھیل، دریا، آبشار

گنگناتی اک ندی اپنی ہی دُھن میں ہے مگر
کر رہا ہے کتنے برسوں سے اشارہ، آبشار

دفعتاً سارے مناظر کھو چکے اپنی کشش
جب سے ان تشنہ نگاہوں نے ہے دیکھا آبشار

ایک وحشت ناک سناٹے کا غلبہ ہر طرف
اور بڑی حسرت سے تکتا ہے سسکتا آبشار

آگ جب برسائے سورج اور جھلس جائے زمیں
ایسے میں انمول ہے قدرت کا تحفہ آبشار

●

○

بنا رہا تھا شرارت کا دائرہ جگنو
دکھا کے راہ مسافر کو چھپ گیا جگنو

کسی بھی لمحے چمک ماند ہی نہیں پڑتی
ترا خیال ہے ظالم کمال کا جگنو

یہی امید کی صورت ہے، آخری صورت
مرا پیام وہاں تُو ہی لے کے جا، جگنو

وجود صحرا میں پھر در بدر بھٹکتے ہوئے
مجھے اداس جو دیکھا تو رو پڑا جگنو

یہی ہے سچ مرے اندر بہت اندھیرا ہے
مگر یہ دور ہو کیسے، کبھی تو آ جگنو

●

نظمیں

دھوپ ایسی تو نہیں تھی پہلے

دھوپ ایسی تو نہیں تھی پہلے
یہ ہر اک چہرے کو دمکاتی تھی
اپنی کاوش پہ یہ مسکاتی تھی، اتراتی تھی
کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ کون سی آفت آئی
دھوپ نے اپنی تباہی کے نشاں ثبت کیے
سوچتے سوچتے اب ذہن بھی تھک جاتا ہے
دلِ افسردہ پھر آرام کہاں پاتا ہے
پہلے جب ذہن میں کچھ برف سی جم جاتی تھی
اپنے آنچل میں سمیٹے ہوئے ننھی کرنیں
دھوپ آنکھوں کے دریچے سے اتر آتی تھی
من کے آنگن میں بڑی روشنی ہو جاتی تھی
پھر ہر اک چہرے پہ چھاتا تھا محبت کا سرور
اپنی تابانی پہ ہوتی تھی ہر اک شے مسرور
اب وہی دھوپ ہر اک چہرے کو جھلساتی ہے

ذہن کی بھٹی میں اب برف کے بدلے لاوا
تپتا رہتا ہے یہی دھوپ اسے
اپنے اندر کی تمازت سے یوں پگھلاتی ہے
اصل پہچان ہر اک چہرے کی چھن جاتی ہے
دھوپ ایسی تو نہیں تھی پہلے

●

موسم آئے گا، ضرور آئے گا

زندگی تو بھی مجھے اجنبی گردانتی ہے
یاد کر یاد و، ہی پیڑ ہوں میں
جس کی چھاؤں کے تلے
تو نے اک عمر گزاری ہے
اور تو پھر بھی مری ذات سے ناواقف ہے
دھوپ سے جنگ تو جاری ہے مگر
آج جب روٹھ گئی مجھ سے مری پرچھائیں
تو بھی اپنوں کی طرح غیر ہوئی جاتی ہے
زندگی تو مجھے کیوں اجنبی گردانتی ہے
التجا ہے مری پہچان مجھے
میری سوکھی ہوئی شاخوں پہ نہ جا
پھر سے لوٹ آئے گا سبزہ ان میں
میں وہی پیڑ ہوں پہچان مجھے
طنز کے تیر نہ پھینک

ایک احسان ہی کر دے مجھ پر
دھرتی بنجر نہیں پیاسی ہے، اسے پانی دے
موسم آئے گا، ضرور آئے گا، پھر
میری شاخوں پہ پرندوں کا بسیرا ہوگا
منچلے بچے مجھے گھیریں گے
تھک کے راہی کوئی آئے گا مری چھاؤں میں
تھوڑا استائے گا
سو جائے گا
جیسے ممتا کی گھنی چھاؤں میں
ننھا بالک
پل میں سپنوں کی حسیں وادی میں
کھو جاتا ہے

●

رات کی دستک

رات کی دستک سنتے ہی
اک خوف و ہراس
گھر کے در و دیوار سے
ظاہر ہوتا ہے
جب سے اس کوٹھی میں
خوابوں کی نیلامی جاری ہے
گہرے سناٹے
سرگوشی کرتے ہیں
اب آنکھوں میں
خوابوں کے اندیشے پلتے ہیں

●

چاند خفا سا لگتا ہے

آسمان پر جگ مگ کرتے
تاروں کا اک جال بچھا ہے
نور کی چادر
تنی ہوئی ہے امبر میں
کائنات کا ذرّہ ذرّہ
نور کی ہم آغوشی سے سرشار ہوا
لیکن اس منظر سے شاید
چاند بجھا سا لگتا ہے
لگتا ہے کچھ ہوئی ہے اَن بن تاروں سے
اسی بنا پر
چاند نے کالے بادل سے رشتہ جوڑا ہے
کالے بادل خاموشی سے آئے ہیں
پلک جھپکتے آسمان پر چھائے ہیں

جگ مگ کرتے تارے آنکھ سے اوجھل ہیں
چاند ذرا سی دیر کو باہر آتا ہے
آسمان پر جھلک دکھا کر
پھر سے غائب ہو جاتا ہے
چاند خفا سا لگتا ہے

●

مور پنکھ

مور مجھے پھر دیکھتے ہی گھبرایا تھا
سمجھ گیا وہ
یہ موذی کیوں آیا ہے
جھٹ سے اس نے
اپنے بکھرے پنکھ سمیٹے
پیروں اور پروں میں
بجلی سی دوڑی
اگلے پل وہ
پیڑ کی اونچی شاخ پہ بیٹھا تھا
میں نے اس کو دیکھا
اپنی جیت پہ کافی خوش دِکھتا تھا
شاید وہ یہ سوچ رہا تھا
آج کہیں جا کر یہ موذی
مقصد میں ناکام ہوا ہے

لیکن جب میں
گھاس پہ بکھرے
مور پنکھ چننے بیٹھا
اس کی آنکھ میں آنسو آئے
شدت سے احساس ہوا

اب چاہے میں
کتنا بھی محتاط رہوں
یہ موذی مجھ کو
زندہ درگور کرے گا
میرے پنکھ سجا کر
اپنے کمرے کو
زینت بخشے گا

اور دیواروں پر
آویزاں ہو کر میں
جیتے جی مر جاؤں گا

●

ندی کو دیکھ کر

ندی کے حال کو
اب دیکھ کر افسوس ہوتا ہے
ندی کا ایک ماضی تھا
نہ جانے کتنی تاریخی کتابوں میں
ندی کی اہمیت کے
اَن گنت ابواب روشن ہیں
ندی تہذیب کا مسکن رہی ہے
اسی کی موج نے
آغاز میں انسان کو
واقف کرایا
ارتقائی مرحلوں سے
اسی کے صاف اور شفاف پانی نے
یگوں تک
مختلف نسلوں کی
دل سے آبیاری کی

اسی کی چیختی چنگھاڑتی لہروں پہ
غلبہ پا کے انساں نے
ترقی کی
مگر اندھی ترقی نے
ندی کی شکل
اتنی مسخ کر ڈالی
کہ آنکھوں کو کسی صورت
یقیں آتا نہیں
جو کچھ نظر کے سامنے ہے
وہ حقیقت ہے
گندے بدبودار نالے کی طرح جو
بہہ رہی ہے
یہی تو وہ ندی ہے
تذکرے جس کے کتابوں میں بھرے ہیں
کتنی تہذیبوں کا جو مسکن رہی ہے
ندی کے حال کا جب جائزہ
لیتی ہیں نظریں
تو بہت افسوس ہوتا ہے

●

گاؤں کی الّھڑ ندی

وہی تو سامنے ہے
گاؤں کی الہڑ ندی جس میں
بلا ناغہ کنواری لڑکیاں
بے خوف ہو کر
بے خیالی میں نہاتی ہیں
سنہری دھوپ کی کرنیں
جواں جسموں سے ہو کر
پانیوں میں نور بھرتی ہیں
ندی کا گدلا اور مٹ میلا پانی
بس اسی لمحے بہت شفاف لگتا ہے
جواں جسموں کو چھپ کر
دیکھنے والی نگاہوں میں
عجب سا اضطراری خواب پلتا ہے

●

اڑنے کا نشہ

ساتھ اڑنے کا نشہ ذہن کو کرتا سرشار
کاش ہم دونوں پرندوں میں بدل جاتے کبھی
پھر تو آزاد فضاؤں میں چہکتے ہوتے
کسی بندش کا کبھی آتا نہیں کوئی خیال
کبھی جھیلوں کے کناروں پہ بسیرا کرتے
کبھی بل کھاتی ہوئی ندیوں میں تن من دھوتے
کبھی تو سرد پہاڑوں پہ گزارہ کرتے
اور کبھی گرم علاقوں کا بھی دورہ کرتے
کبھی برسات میں جی بھر کے بھگوتے خود کو
اور کبھی پھولوں کے موسم میں مہکتے ہوتے
کبھی کھیتوں کی منڈیروں پہ بھی ہوتا مسکن
اور کبھی شہروں کو بھی اپنا بناتے آنگن
کبھی تو آم کے باغات میں بھی ستاتے

اور کبھی جا کے چناروں میں کہیں چھپ جاتے
کبھی برگد کی گھنی چھاؤں سے دل بھر جاتا
کبھی پیپل تو کبھی نیم ہمیں راس آتا
جب کسی چیز سے دل اونے لگتا اپنا
ہم اسی لمحے نئے دیس کا رُخ کر لیتے
اَن گنت خوابوں کو ان آنکھوں میں پھر بھر لیتے
اور پرواز کی حد سے بھی نکل جاتے کبھی
کاش ہم دونوں پرندوں میں بدل جاتے کبھی

●

پیڑ اور بوڑھی آنکھیں

پیڑ لگانے والی بوڑھی آنکھیں
باغ کے ننھے منے رکھوالوں کو
دیکھ کے ایسے خوش ہیں
جیسے انھیں انمول خزانہ ہاتھ لگا ہے
ماضی میں جن پودوں کو
سینچا تھا انھوں نے
لہو سے اپنے
وہ پودے اب گھنے درختوں کی صورت
آنکھوں کو خیرہ کرتے ہیں
گھنے درختوں کی چھاؤں میں
باغ کے ننھے منے رکھوالے ستاتے ہیں
اپنے ننھے ہاتھوں سے
مٹی کی پرت ہٹاتے ہیں
چھوٹے چھوٹے پودوں کو

مٹی کا سہارا دیتے ہیں
بڑے جتن سے پانی لا کر
ان ننھے پودوں کی پیاس بجھاتے ہیں
ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے جب
ننھی شاخیں جھومتی ہیں
تو مارے خوشی کے پھول سے بچے
شور مچاتے ہیں
اور بے خود ہو جاتے ہیں
روز کے اس منظر کو دیکھ کے
پیڑ لگانے والی بوڑھی آنکھیں
نم ہو جاتی ہیں

●

پانی کا کہرام

پانی پانی کی ہنگامی آوازیں اب
چیخ کی صورت
گونج رہی ہیں
ہر گاؤں میں
ہر قصبے میں
اب تو شہر بھی
ان آوازوں کے کہرام سے
گھائل ہیں
وقت سے پہلے مرجانے کی ہوڑ لگی ہے
پانی کو اپنے قبضے میں کرنے کو
بھاگ رہی ہے ساری خلقت
اب ندیوں کی طغیانی
تقسیم کی زد میں آئے گی
پھر کوئی محفوظ نہیں رہ پائے گا

شعلوں کی لپٹوں سے دنیا جھلسے گی
اس سے قبل کہ
پھر اک جنگِ عظیم
ہماری پیاری دنیا کو نفرت کے
خوف ناک پنجوں سے لہولہان کرے
ہم پانی کو لہو کی صورت
ہر پل ضائع ہونے سے محفوظ رکھیں
اسی بہانے ہم سب شاید
وقت سے پہلے مر جانے سے دور رہیں

●

زمیں کی فریاد

جہاں پر سبز چادر کی حکومت تھی
جہاں پر لہلہاتی، جھومتی گاتی ہوئی
فصلوں کی رعنائی
نگاہوں میں عجب سا نور بھرتی تھی
وہاں اب دور تک پسرا پڑا ہے
ایک ہیبت ناک سناٹا
زمیں کے لب بہت سوکھے ہوئے ہیں
جا بجا اب چاک ہوتا جا رہا ہے
خوب صورت سی زمیں کا پیرہن
اب پیاس بڑھتی جا رہی ہے
اس زمیں کی پیاس اب
ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہے
آسماں خاموش ہے
لیکن زمیں فریاد کرتی ہے
پرانے موسموں کی ہر عنایت کو
بہت حسرت سے دل میں یاد کرتی ہے ●

ہوا بے چین ہے

ہوا کچھ ان دنوں
بے چین سی لگتی ہے
یہ جب بھی
جہاں سے بھی
گزرتی ہے
عجب سی بوکھلاہٹ کا
گماں ہوتا ہے ہر پل
یوں لگتا ہے
کسی شے کی طلب نے
اس کو پاگل کر دیا ہے
پرندے التجا کرتے ہیں
سارے پیڑ اس کی منتیں کرنے میں
ہر لمحہ یہاں مصروف رہتے ہیں
مگر پھر بھی

ہوا کی بوکھلاہٹ میں
کبھی کوئی کمی آتی نہیں ہے
ہوا کی اضطرابی کیفیت
شاید نہیں بدلے
حقیقت تلخ ہوتی ہے
یہی شاید حقیقت ہے
ہوا اب بھی
پرانے موسموں کے عشق میں
بے حال پھرتی ہے
نہیں جو لوٹ کر آئیں گے
ان لمحوں کو روتی ہے

●

ہوا جب گنگناتی ہے

ہوا جب گنگناتی ہے
تو ہر منظر
بہت شاداب لگتا ہے
درختوں پر پرندے
چہچہاتے ہیں
پہاڑوں سے
اچھلتی کودتی ندیاں نکلتی ہیں
گھٹائیں جھوم کر نغمہ سناتی ہیں
کلی کے عشق میں
بھونرے مچلتے ہیں
ہوا جب گنگناتی ہے
اسی لمحے میں جیسے
روح کی گہرائی سے

آواز آتی ہے

کچھ ایسا ہو

ہوا کی گنگناہٹ

یونہی ہر خطے میں جاری ہو

نشہ سرشاریوں کا

دیر تک ذہنوں میں طاری ہو

●

ہوا روتی بھی ہے

فضائیں نغمہ زن ہوں
تو ہوا کی گنگناہٹ کو
سبھی محسوس کرتے ہیں
فضاؤں میں اگر
انجانے سے اک خوف کا غلبہ ہو
تو پھر پوری شدت سے
ہوا کی سرسراہٹ
ذہن کو بے چین کرتی ہے
کبھی طوفان اور آندھی کی شکلوں میں
ہوا تو چیختی چنگھاڑتی بھی ہے
کسی نے بھی مگر اس بات پر
سنجیدگی سے غور کرنے کی
ضرورت ہی نہیں سمجھی
ہوا روتی بھی ہے

اور سسکیوں سے خوب روتی ہے
وہ پہروں سسکیوں میں
درد و غم اپنے سموتی ہے
مگر ان سسکیوں کو
رونے کی دل دوز سی آواز کو
سننے کی ہمت کس میں ہوتی ہے؟

●

شام کی اڑان

شام کے سرمئی اندھیرے میں
اک پرندہ اڑان بھرتا ہے
چاہتا ہے کسی کا ساتھ ملے
رات کی بے قراریوں کا عذاب
یاد کر کے وہ کانپ اُٹھتا ہے
اس لیے شام کے دھندلکے میں
گھونسلے کو وہ چھوڑ دیتا ہے
اور مسلسل سفر میں رہتا ہے
لیکن اس کا سفر سدا کی طرح
تشنگی کا عذاب سہتا ہے

●

صبح کا جادو

صبح ہوئی اک نیا سویرا آ پہنچا
اس کا استقبال کرو
آنکھیں ملنا چھوڑو، لان میں آ جاؤ
دیکھو، روز کا دیکھا منظر
کتنا پیارا لگتا ہے
صبح کی البیلی رنگت کو
اپنے اندر جذب کرو
لان کی نرم ملائم گھاس پہ
ننگے پاؤں چلنے کا اک الگ مزہ ہے
ذہنی اذیت سے چھٹکارا حاصل کر لو
رات کی تلخی بھول بھی جاؤ
تاریکی کا غم نہ کرو

دیکھو صبح کے اجیارے نے

ہر شے کی رنگت کو دونا کر ڈالا

نئے ارادوں سے اپنا رشتہ جوڑو

فرسودہ باتوں سے اب ناطہ توڑو

منزل تم کو گلے لگانے کو

بے تاب ہے دیکھ تو لو

●

پرندہ اور آنسو

بالکنی کی ریلنگ میں
خاموشی سے بیٹھا وہ پرندہ
نم آنکھوں سے، حسرت سے
بے چینی سے دنیا کو تکتا
ہر لمحہ اس فکر میں ڈوبا رہتا ہے
کب اس کے خیالوں کی دنیا آباد ہوگی
کب اس کی اُمنگیں
ایک نئی لذت سے پھر سرشار ہوں گی
کب اس کے اک چھوٹے سے مسکن کی
تعمیر کا خواب مکمل ہو پائے گا
چونچ میں اپنی گھاس اور تنکے
لا کر اس نے اک انبار لگایا تھا
اور بڑے جتن سے
گھونسلے کی اک شکل بنائی تھی

لیکن جو پرانی خادمہ ہے اس کوٹھی کی
وہ بیگم صاحب کی ہر ایک ہدایت
جیسے ہر پل ذہن نشیں رکھتی ہے
بڑی نفاست سے اپنے ہر کام کو کرتی ہے
بالکنی کے کونے میں بکھرے
گھاس اور تنکوں کا وہ ڈھیر
اسے تڑپاتا ہے
وہ اپنے اک مخصوص انداز میں
ناہنجار پرندوں کو جی بھر کے کوستی رہتی ہے
اور بے دردی سے
تنکوں کا وہ ڈھیر ہٹاتی ہے
اگلے ہی پل
کوٹھی کی زیبائش اور نفاست میں
دلچسپ اضافہ ہوتا ہے
بالکنی کی ریلنگ میں بیٹھا وہ پرندہ
خون کے آنسو روتا ہے

●

پرندہ اور گھونسلا

شفق کی لالی دیکھو آسماں سے ہو رہی رخصت
دھندلکا شام کا اب پھیلتا جاتا ہے ہر جانب
ہوا خاموش رہ کر بھی کوئی دُھن چھیڑ دیتی ہے
پرندے غول میں اپنے ٹھکانوں کی طرف پلٹے
اُجالے میں کہیں بھٹکیں، اندھیرا ہوتے ہی لیکن
خموشی سے یہ اپنے گھونسلوں کو لوٹ جاتے ہیں
جو تنکوں سے بنایا ہے ٹھکانہ ان میں ستا کر
تھکن یہ بھول جاتے ہیں، انھیں آرام ملتا ہے
اُجالے میں پرندہ چاہتا ہے سیر کو جائے
بھٹکنا پڑتا ہے دانے کی خاطر ہر جگہ اس کو
مگر وہ شام میں اپنے ٹھکانے کو پلٹتا ہے
پرندہ کچھ بھی بھولے گھونسلے کو یاد رکھتا ہے
مگر تم اس حقیقت سے نگاہیں کیوں چراتی ہو

پرندہ گھونسلے میں قید ہوکر جی نہیں سکتا
کھلے امبر میں اس کو چاہیے تھوڑی سی آزادی
تم اپنے اس پرندے کو نہیں پرواز سے روکو
بیاباں کی، گلستاں کی اسے کچھ سیر کرنے دو
اندھیرا ہوتے ہی یہ گھونسلے میں اپنے آئے گا
مزے کی نیند سوئے گا، تھکن اپنی مٹائے گا

●

پیڑ کٹتے جا رہے ہیں

نگاہوں میں ابھی کچھ دیر پہلے تک
درختوں کا طویل اک سلسلہ تھا
زندگی سے رابطہ تھا
پلک جھپکی تو ہر منظر ہوا تبدیل جیسے
درختوں کی جگہ ہم نے
ہزاروں چھوٹے چھوٹے جیل خانے
کر لیے تعمیر
ان میں قید ہو کر
ہم نے اپنی شان میں
خود ہی قصیدے پڑھ لیے
یہ بھی نہیں سوچا
غضب کی سردیوں میں
بے تحاشا بارشوں کا قہر کیوں جاری ہے
کیوں سوکھا پڑا ہے

موسمِ باراں میں ہر جانب
اذیت گرمیوں کی
خون کے آنسو رُلاتی ہے
تو آخر کیوں؟
سوالوں کے بھنور میں
سب الجھتے جا رہے ہیں
جو سیدھا سا جواب ہے
ان سوالوں کا
اسے ہی سب نظر انداز کرتے جا رہے ہیں
مہذب ہونے کے معنی بدلتے جا رہے ہیں
تبھی تو پیڑ کٹتے جا رہے ہیں

●

املی کا پیڑ اور پشتینی آنگن

بہت شہرہ تھا قصبے میں
وہ پشتینی عمارت آج تک محفوظ ہے
اس کے مکینوں میں
محبت کا عجب رشتہ ہے باقی
شہر کے اثرات سے
محفوظ ہے آنگن کی ہر اک شے
مگر تاریکیوں کا
ایک ہیبت ناک سناٹا
اسی آنگن میں
اپنے پاؤں پھیلانے لگا ہے
گھنی شاخوں سے مالا مال تھا
جو پیڑ املی کا
جہاں پر چہچہے کرتے پرندے
غول میں آ کر غضب کا شور کرتے تھے
جہاں پر ہر گھڑی

کچھ من چلے بچوں کی ٹولی
کھٹی میٹھی املیوں کا لطف لینے کو مچلتی تھی
اسی پشتینی آنگن میں
وہ املی کا پرانا پیڑ کاٹا جا رہا ہے
کئی مزدور ہیں مصروف
بنیادوں کی مٹی کھودنے میں
گھنی شاخوں سے مالا مال
املی کا پرانا پیڑ کاٹا جا رہا ہے
ڈھیر ساری کھٹی میٹھی یادیں
رخصت ہو رہی ہیں
چہچہے کرتے پرندے
بے بسی سے اپنے مسکن کی
تباہی دیکھتے ہیں
یہ وہی پشتینی آنگن ہے
کہ جس کا سارے قصبے میں
بہت شہرہ تھا لیکن
اب اسی آنگن میں
دیواریں اُٹھائی جا رہی ہیں
یہ بڑا آنگن بھی
شہروں کی ترقی سے کہاں محفوظ رہ پایا •

مٹی کی خوشبو

ابھی سب کچھ نہیں بدلا
ابھی تک ذہن میں
تازہ تخیل کی سحر کاری
ہمیں شاداب رکھتی ہے
ابھی تک گل مہر کے پھول
ویسے ہی تر و تازہ ہیں
ان میں ایک انجانی کشش
اب بھی سلامت ہے
ابھی تک نیم کی شاخوں میں
ہریالی دمکتی ہے
ابھی تک باجرے کی فصل
کھلیانوں میں میلوں لہلہاتی ہے
ابھی تک مٹیوں کی

سوندھی سوندھی خوشبوؤں سے
ذہن کی وادی معطر ہے
ابھی تک شہر کے ایندھن میں
جل کر بھی ہمارے ذہن میں
دیہات زندہ ہے
ابھی سب کچھ نہیں بدلا

●

سمندر چیختا رہتا ہے

سمندر چیختا رہتا ہے
رات اور دن
ہمیں آگاہ کرتا ہے
جو برفیلے علاقے تھے
جہاں ہر چیز جامد اور ساکت تھی
وہاں ہر شے پگھلتی جا رہی ہے
توازن میں کمی آنے لگی ہے
سمندر کی قیامت خیز لہریں
ساحلوں کو چھوڑ
شہروں کی طرف بڑھنے لگی ہیں
شہر اک لمحے
ذرا سا چونکتا ہے
بے حسی کے خواب سے
بیدار ہوتا ہے

مگر پھر سے
مشینی زندگی کی تیز رفتاری
توجہ کھینچ لیتی ہے
سمندر چیختا رہتا ہے
پھر کوئی نہیں سنتا
فنا کی موج
خاموشی سے اپنا کام کرتی ہے
دلوں میں زندگی سے
پیار کی معصوم سی خواہش
بڑی سہمی سی رہتی ہے

●

سمندر کی بے تاب لہریں اور تم

سمندر کی اچھلتی کودتی موجوں کو
اتنے شوق سے
آغوش میں بھرنے کی بے تابی
کہاں سے آ گئی تم میں
مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا
اس قدر بے خوف ہو کر
اپنے محسوسات کا اظہار کرنا بھی
تمہاری شخصیت کا ایک حصہ ہے
بہت اچھا کیا تم نے
سمندر کی بپھرتی،
چیختی، چنگھاڑتی موجوں کو
اپنا ہم نوا کر کے
بہت معصومیت کے ساتھ
اندر کی گھٹن کو

اضطراری کیفیت کو
ان تھپیڑوں کے حوالے کر دیا ہے
اب غضب کی تازگی چہرے سے ظاہر ہے
بہت اچھا کیا تم نے
گھٹن اندر ہی اندر
تم کو زندہ دفن کرنے کو
بڑھے جب بھی
سمندر کی تلاطم خیز لہروں کو
اسی صورت تم اپنا ہم نوا کرنا
اچھلتی کودتی موجوں کو ایسے ہی
بہت بے خوف ہو کر
شوق سے آغوش میں بھرنا

●

گیلی ریت کا المیہ

دور تک تا حدِ منظر ریت
گیلی ریت کا اک سلسلہ بکھرا پڑا ہے
لہریں ساحل سے لپٹنے کو مچلتی ہیں
مچلنے کے نتیجے میں
بہت بے تاب ہو کر سر پٹکتی ہیں
مجھے بھی دور تک
پھیلی ہوئی یہ رات بھاتی ہے
نگاہوں میں بہت اچھا سا منظر خلق کرتی ہے
مگر میں نے کبھی بھی ریت کے انبار میں
جذبات اپنے نقش کرنے کی
کوئی کوشش نہیں کی
اس لیے تم کو سدا مجھ سے شکایت ہی رہی
میں نے تمہارا نام
گیلی ریت پر لکھا نہیں
اور اس بنا پر تم نے مجھ کو
عام عاشق کے بھی خانے میں نہیں رکھا

مگر تم ہی بتاؤ
عام عاشق کا رویہ
مجھ میں کب غالب تھا

میں یہ جانتا ہوں
جو بھی کچھ لکھا ہے گیلی ریت پر
بس چند لمحوں کا اثاثہ ہے
اچھلتی کودتی موجیں
ذرا سی دیر میں آئیں گی
اور سب کچھ بہا لے جائیں گی
لیکن بتاؤ کس طرح میں
خواب میں سرشار
آنکھوں سے
تمہارے نام کے ایک حرف کو
مٹتا ہوا دیکھوں
میری مجبوری یہ ہے
میں کسی صورت بھی یہ دل دوز منظر
دیکھ سکتا ہی نہیں
اور اس لیے بس
میں تمہارا نام
گیلی ریت پر لکھتا ہوں ●

بادلوں کا رقص

آسماں پر بادلوں کا رقص جاری ہے
کئی دن سے
کڑکتی بجلیوں کی تھاپ
ان کے رقص میں جادو جگاتی ہے
زمیں کے سوکھے خطے
حسرتوں سے، خامشی سے
بادلوں کے رقص کا دیدار کرتے ہیں
کڑکتی بجلیوں کی تھاپ
ان کی اضطرابی کیفیت کو
اور بھی مہمیز کرتی ہے
تو پھر امید بندھتی ہے
زمیں کے سوکھے خطے
اس دفعہ سیراب ہو جائیں گے
لیکن دیکھتے ہی دیکھتے

منظر بدلتا ہے
اچانک بادلوں کی اوٹ سے
سورج نکلتا ہے
زمیں کے سوکھے خطے
بادلوں کے رقص سے
محروم ہوکر
ٹوٹ جاتے ہیں
بہت آنسو بہاتے ہیں

●

موسم کی پہلی بارش

موسم کی پہلی بارش تو
پیار کے پہلے خط کی طرح
دل میں سرگوشی کرتی ہے
موسم کی پہلی بارش سے
دل کی بنجر زمیں میں
خواہش کے پودے اُگ آتے ہیں
ان پودوں کو نوچ پھینکنا
کسی طرح بھی
کب ممکن ہو پاتا ہے
خواہش کے وہ پودے تو
ہر لمحہ بڑھتے جاتے ہیں
اور دل میں آگ لگاتے ہیں
موسم کی پہلی بارش کا
استقبال اگر ہم دل سے کرتے ہیں

تو اپنے اندر سے زندہ ہونے کی
خوشی دوبالا ہو جاتی ہے
دل سے ایک صدا آتی ہے
موسم کی پہلی بارش کے
استقبال میں یہ لازم ہے
جسم کے ساتھ ہماری روح بھی
اس بارش کی بوندوں سے
جل تھل ہو جائے
عقل یہ سارا کھیل سمجھ نہ پائے
پاگل ہو جائے

●

بارشوں کا قہر

بجلیوں کے شور سے
ذہنوں میں دہشت کی لکیریں
یوں اُبھرتی ہیں
کہ جیسے
ایک لمحے میں وہی دل دوز منظر
سب کی آنکھوں میں سمائے گا
مسلسل بارشوں کا قہر جاری ہے
یوں لگتا ہے
وہی پچھلے برس کا واقعہ
اس سال بھی
ویران آنکھوں کو
مسلسل خون کے آنسو رُلائے گا

●

دریا پھر سے اُمڈ پڑا ہے

دریا پھر سے اُمڈ پڑا ہے
موجوں کی طغیانی
کوئی اور کہانی کہتی ہے
اس خطے کی
ہر شے سہمی لگتی ہے
آج پرانی کشتی سے
تو بات نہیں بننے والی
پیارے مانجھی
کیا یہ بہتر نہیں ہے
ہم سب مل کر
ایک بڑی مضبوط سی کشتی
بلکہ ایک توانا بیڑے کی تکمیل میں
جٹ جائیں

کہیں نہ ایسا ہو
پھر موجوں کی طغیانی
اس خطے کی ویرانی کو
اپنا نصب العین سمجھ لے

●

ریت کا طوفاں

ریگستان کی وسعت کا نظارہ
پاگل کرتا ہے
نظر کی حد ہے جہاں تلک بھی
تپتی ریت کی چادر
چاروں اور بچھی ہے
ریگستان عموماً تو
خاموش رہا کرتا ہے لیکن
ریت کا طوفاں
کبھی کبھی جب آتا ہے
تب ہیبت ناک نظارہ
دل دہلاتا ہے
اپنے دم پر جھنڈ بنا کر
ریت کا دریا

پار جو کرنے چلے تھے

وہ سب
ہیبت ناک نظارے کا
حصہ بن جاتے ہیں
ریگستان میں عبرت کے قصے
دب جاتے ہیں

●

موج اور گرداب

دیکھتے دیکھتے بڑھنے لگا دریا کا بہاؤ
خوف ناک ہونے لگا اب تو ہواؤں کا مزاج
اس قدر شور بپا ہے کہ لرزتا ہے جگر
کشتیاں لے کے جو نکلے تھے پلٹ آتے ہیں
ہر طرف سے یہ صدا آتی ہے جائے نہ کوئی
سر پھری، چیختی، بپھری ہوئی موجوں کے قریب
لوگ ہشیار ہیں موجوں کا اشارہ پا کر
بڑی خاموشی سے ساحل کی طرف آتے ہیں
ان کو موجوں سے الجھنے کی نہیں بے تابی
آکے ساحل پہ عجب چین انھیں ملتا ہے
اب بھنور کا انھیں خطرہ ہے نہ طوفان کا ڈر
تھک کے بے حال قدم بڑھتے ہیں گھر کی جانب
اور اک میں ہوں کہ دنیا سے الگ سوچ مری

لوگ جب بھاگ رہے ہوتے ہیں موجوں سے تو میں
ناؤ کو کرتا ہوں اس وقت ہی دریا کے سپرد
تا کہ موجوں سے وہ ہر گام الجھتی ہی رہے
تا کہ گرداب میں ڈوبے بھی، ابھرتی بھی رہے
مجھ کو طوفان کا اب خوف ستاتا ہی نہیں
دل نے یہ حوصلہ پایا ہے تری قربت سے
ذہن کو ایک نیا جوش ملا صحبت سے
تو نے بتلایا کہ بکھراؤ کی راحت کیا ہے
تو نے دکھلایا فنا ہونے کی لذت کیا ہے

●

قدرت کے تحفے

ٹھٹھرتی سردیوں میں

نرم پیاری دھوپ
آنگن میں اترتی ہے
تو اس کی روح افزا
زندگی سے پُر حرارت کو
لہو میں رقص کرنے دو
اگر اک چھت میسر ہے
تو نیلے آسماں کی وسعتیں دیکھو
شفق کی سرخیوں پر
جب اندھیرا پاؤں پھیلائے
تو پھر امبر میں
جگ مگ کرتے تاروں کو
نگاہیں بھر کے دیکھو
جب گھٹن کمرے میں حاوی ہو

تو کھڑکی اور دروازوں کو وا کر کے
ہوا کو اپنی سانسوں میں اُتارو
اگر تم بارشوں میں
بھیگنے کے لطف سے
سرشار ہونا چاہتے ہو
شوق سے تم اپنی ہر خواہش کو
اک دل کش، بہت ہی خوش گوار
انجام سے دو چار کر لو
انھیں جی بھر کے استعمال کرنے میں
کوئی پیسہ نہیں لگتا
کسی بھی ٹیکس کی زد سے
سبھی محفوظ رہتے ہیں
یہ سب قدرت کے تحفے ہیں

●

پرندے پالنے کا شوق

پرندے پالنے کا شوق
اچھا ہے مگر
تم نے کبھی یہ بھی نہیں سوچا
کہ جانے اور انجانے میں تم نے
زندگی کے نام پر
کتنی بھیانک موت کی
سوداگری کی ہے
یہ پنجرے خوب صورت ہیں
کشادہ ہیں
یہ لوہے کی سنہری جالیاں
تازہ ہوا اور روشنی کے واسطے
کافی ہیں لیکن
کھلی آب وہوا میں اڑنے والے
ان پرندوں کی تمام آزادی
تم نے چھین لی
تم نے کبھی ان کی نگاہوں میں

چھلکتے آنسوؤں کو کیوں نہیں دیکھا
تمہارا دل کبھی ان بے زبانوں کی
بہت خاموش آہیں سن کے
آخر کیوں نہیں پگھلا
مجھے اندازہ ہے تم اتنے پتھر دل نہیں تھے
زندگی نے مبتلا رکھا تمہیں
جب بھی مسلسل آزمائش میں
تو پھر تم نے اذیت سے فرار حاصل کیا
اور وحشیانہ شوق پالے
پھر بھی کیسی بے قراری اور تڑپ
چہرے سے ظاہر ہے
خوشی کے ذائقے سے
آج تک محروم ہو، لیکن
اگر اس ذائقے سے
آشنا ہونے کی خواہش ہے
تو پھر ان بے زبانوں کو
ابھی آزاد کر دو
کون جانے
زندگی کی تلخیوں سے
تم بھی پھر آزاد ہو جاؤ ●

نیلی چھتری

نیلگوں آسماں کی حدوں سے اگر
تم کو باہر نکلنے کی خواہش ہے
تو اپنی خواہش کو سینے میں ہی
دفن کر دو
ہزاروں ترقی کے زینوں پہ
چڑھ کر بھی تم
اپنے مقصد میں ناکام ہو گے
یہاں تک کہ نیلی سی چھتری کو
چھونے کی خواہش بھی
تم سے نہ انجام پائے گی
تم نے ترقی بہت کی
مگر اس حقیقت کو
شاید ابھی تک نہیں تم نے مانا
کہ کوئی بھی اس کی حدوں سے نکل کر

نہیں بھاگ سکتا

تمہارا یہ سارا ہنر، یہ تمام علم
کس کام ہے بتاؤ ذرا
کیوں تمھیں مختلف پہلوؤں پر ابھی
غور کرنے کا موقع نہیں ہاتھ آیا
ابھی وقت ہے غور کرلو
اور اپنی حدوں میں رہو
نیلی چھتری کے ہر فلسفے کو
سمجھنے کی کوشش کرو

●

بادل سے ملاقات

صبح دم روز ہی بادل سے ملاقات
تو معمول کا اب حصہ ہے
یہ ملاقات مجھے روز ہی
مرنے سے بچا لیتی ہے
شہر سے بھاگ کے آیا ہوں
اس مقصد سے
صبح دم روز ہی منظر یہ اُبھر آتا ہے
آنکھیں ملتے ہوئے بستر سے
تھکن اُٹھتی ہے
ایک پیاری سی تھکن
جس کے طفیل
ایک سرشاری نصیب ہوتی ہے
کھڑکیاں کھلتے ہی بادل کے بہت سے ٹکڑے
اس طرح کمرے میں آ جاتے ہیں

جیسے کہ یہی مسکن ہے
نینداور خواب سے معمور نگاہوں میں
نمی آتی ہے
اور چمک چہرے کو گلنار بنا دیتی ہے
کاہلی الٹے قدم بھاگتی ہے
اک عجب تازگی سے
ذہن معطر سا ہوا جاتا ہے
بھاگتے دوڑتے شہروں سے
بلاوے تو بہت آتے ہیں
لیکن اس خطے کو اب چھوڑ کے
کیسے جاؤں
کوئی تو راستہ ایسا بھی
نکلتا اے کاش
اس پہاڑی پہ شب و روز
بسر ہوتے مرے
اور بادل سے بلا ناغہ ملاقات مجھے
روز مرے کی اذیت سے بچا لے جاتی

●

موسموں کی بے رخی

پہاڑوں میں ابھی تک
برف باری کا کوئی بھی سلسلہ
آنکھوں کو فرحت بخش نظارہ
فراہم کرنے سے قاصر رہا ہے
بہت مایوس ہے سیلانیوں کی
اک بڑی تعداد
کتنی بے قراری اور بے چینی سے لوگوں نے
دہکتے موسم کا کرب جھیلا
اور سردی کی نشیلی ٹھنڈ کو
آنکھوں میں بھرنے کے لیے
دل کش پہاڑی سبز خطے میں پناہیں لیں
مگر افسوس اب تک
برف کی ننھی پھواروں کا
کوئی بھی سلسلہ آغاز سے محروم ہے

سیاح لوگوں کی
مسلسل بڑھ رہی ہے چینیوں سے
اک عجب سا خوف طاری ہو چلا ہے
ڈھیر سارے دوسرے معصوم لوگوں پر
یہ وادی کے مقامی لوگ ہیں
جو برف باری کے لیے
دل سے دعائیں کر رہے ہیں
موسموں کی بے رخی کو دیکھ کر
اندر ہی اندر مر رہے ہیں

●

پانی کی تسکین

چلچلاتی گرمیوں میں
تپتے انگاروں پہ ننگے پاؤں
اک لمبا سفر کرنے کو
نکلی ہے وہ لڑکی
سانولی، چنچل سلونی سی وہ لڑکی
جو بہت خاموش ہے اب
فکر کی گہری لکیریں
اس کے چہرے سے نمایاں ہیں
کمر میں اک گھڑا اور سر پہ گاگر
لے کے وہ حیراں، پریشاں بھاگتی ہے
سوچتی ہے
آج بھی اس کے پہنچنے سے بہت پہلے
وہ پوکھر
کم سنوں کی بے تکی یلغار سے پھر

گندگی کے ڈھیر بھی تبدیل ہو جائے
تو آخر کیا کرے گی وہ
جو گھر میں لوگ ہیں
وہ پانی کے قطروں سے
تھوڑی سی طراوت کا سجائے خواب
کانٹا بن گئے ہیں
ہزاروں وسوسوں اور ڈھیروں اندیشوں
سے لڑتی ہے وہ لڑکی
فکر کی گہری لکیروں کو سمیٹے
تیز قدموں سے
بڑے پوکھر کو جاتی ہے
وہاں پوکھر کو تھوڑا صاف پا کر
من ہی من میں مسکراتی ہے

●

ہوا کی ناز برداری

ہوا پہلے کبھی اتنی تو ظالم تھی نہیں
پھر کس نے اس کے کان بھر ڈالے
نہ جانے کس کے بہکاوے میں آ کر
یہ سُنا سارا ستوں سے
اب گزرتی ہی نہیں ہے
اب درختوں کی سبھی شاخیں
بہت خاموش لگتی ہیں
ہزاروں پتیاں ساکت ہیں
ان میں کوئی بھی جنبش نہیں ہوتی
نظر کے سامنے پھیلے مناظر میں
عجب ویرانی کا ماتم ہے شامل
جو پرندے اک نرالی شان سے
شاخوں پہ نغمے گنگناتے تھے
وہ اب بے جان سے گونگے سے لگتے ہیں

پرندوں کی نگاہوں کی لویں بھی
ٹمٹماتی ہیں
وہ اپنی سہمی سہمی نظروں سے
ویراں مناظر کو
بڑی حسرت سے تکتے ہیں
طبیعت ایک فرحت بخش
لمبی سانس لینا چاہتی ہے
پھیپھڑے تازہ ہوا کی راہ تکتے ہیں
مگر اس حبس کے عالم سے
چھٹکارا نہیں ملتا
ہوا کی ناز برداری ہی
سارے مسئلوں کا حل سلجھائے گی
گھٹن اور حبس کی اس کیفیت میں
اضطرابی ذہن سے آواز آتی ہے
ہوا روٹھی ہے تو پھر مختلف حربوں سے
اس کو پہلی فرصت میں
منا لینے کی خواہش کلبلاتی ہے

●

سوکھے پتّوں پر بارش

سوکھے کھیتوں پر جب بارش اپنا رنگ دکھاتی ہے
لہریں سُر میں گاتی ہیں، دھرتی جل تھل ہو جاتی ہے
کھیتوں کی فصلوں کو پھر نقصان اُٹھانا پڑتا ہے
اس نقصان پہ قابو پانے کی خاطر، سب رکھوالے
تیز بہاؤ کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں
کھیتوں کی مینڈوں پہ مسلسل مٹی ڈالتے رہتے ہیں
لیکن ان کی کوشش پھیکی پڑنے لگتی ہے اس دم
جب پانی کا ریلا شور مچاتا آگے بڑھتا ہے
مینڈوں پر ڈالی مٹی بہہ جاتی ہے اک جھٹکے میں
یا پھر کھیت کا پانی دوسری جانب بہنے لگتا ہے
کوئی کوشش تیز بہاؤ کو روک نہیں پائی اب تک
ہر حالت میں وہ تو مسلسل آگے بڑھتی جاتی ہے
ایسا ہی اک تیز بہاؤ محبت کا ہے مجھ میں بھی
اندر کی پتھریلی مٹی کو جو کاٹتا جاتا ہے

لیکن دنیا اسی بہاؤ کو روکنے کی کوشش میں ہے
یہ دنیا معصوم بہت ہے، سچائی سے ہے انجان
کاش یہ دنیا مرے بہاؤ کا کچھ اندازہ کر پاتی
کاش یہ دنیا مجھ جیسے دیوانوں کو بھی سمجھ پاتی

●

موسم کا سبق

چمن کی فضاؤں کی شادابیاں
یوں ہی قائم رہیں گی
گلستاں میں پھولوں کے کھلنے کا
یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا
چمن کی فضا میں
یونہی شوخ کلیوں پہ
بھونرے مچلتے رہیں گے
چنبیلی کے پودوں پہ شبنم کے قطرے
دمکتے رہیں گے
ہوا باغ کے سارے پودوں پہ
شفقت لٹاتی رہے گی
خوشی کے ترانے سناتی رہے گی
اگر درمیاں میں
کوئی رُت بدلتی ہے

تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے
کہ گلشن کے معمول میں
کوئی واضح نشیب و فراز آ گیا ہے
اگر ایک موسم بدلتا ہے تو
تھوڑی تبدیلی گلشن میں آتی ہے لیکن
بہت جلد سب کچھ
بدلتی فضاؤں کے ہمراہ
فطری تغیر کی صورت
بدلتا چلا جاتا ہے
اور پھر وقت کے ساتھ سب کچھ ہی
معمول کا لازمی جزو
بنتا چلا جاتا ہے
اس لیے کیوں نہ ہم بھی
بدلتے ہوئے موسموں سے
سبق کوئی سیکھیں
اور اپنے مزاجوں میں
تبدیلی لانے کی کوشش کریں

●

چہچہاتے پرندوں سے برتاؤ

تمہیں چہچہاتے پرندوں سے نفرت ہے
یہ جان کر سخت حیرت ہوئی
پرندوں سے نفرت کی بنیاد پر تم نے
آنگن کے سارے درختوں پر کلہاڑی برسائی
آنگن جو گلزار تھا
اور نگاہوں کی ٹھنڈک کا باعث بھی تھا
پل میں مرگھٹ میں تبدل ہونے لگا
پر تمھیں اس کا افسوس ہوتا بھی کیوں
تمھیں تو عجیب وغریب انسیت خامشی سے ہے
تنہائی سے ہے
تو کیسے یہ تبدیلی تم کو کھلے گی
تمھیں صبح دم ڈھیر سارے پرندوں کی
میٹھی سریلی سی آوازیں
ہر دم پریشان کرتی تھیں

تم جاگ جاتے تھے
غصے سے، نفرت سے کروٹ بدلتے تھے
لیکن سدا نیند آنکھوں سے غائب ہی رہتی تھی

اور اس بنا پر
سکوں کا بہانہ بنا کر
درختوں سے آنگن کو محروم کرنے میں تم نے
کوئی بھی جھجھک کب دکھائی
مبارک ہو تم اب پرندوں کی یلغار سے
چہچہاہٹ سے محفوظ ہو
پر کبھی تم کو فرصت ملے تو ذرا غور کرنا
پرندوں کی وہ چہچہاہٹ
وہ میٹھی سریلی سی آوازیں ان کی
تمھیں جن سے نفرت ہے
دراصل معصوم سے ان پرندوں کی
حمد و ثنا ہیں
وہ پابندی سے اپنے رب کے کرم کا
بلا ناغہ ہر صبح مشترکہ اقرار کرتے ہیں
اور تم نے ان سب کو

حمد وثنا کے مبارک فریضے سے محروم کرنے
میں ہی عافیت اپنی جانی
تعجب ہے سورج کے انگارہ بننے پہ بھی
تم تو غفلت کی نیندوں میں
مصروف ہو
اور اس عافیت کو
ترقی کی معراج کا تم نے
درجہ دیا ہے
مگر ہائے افسوس
یہ تو تمہارے تنزل
تمہاری تباہی کی، بربادی کی
ابتدا ہے
●

سارنڈا* کے جنگلوں سے گزرتے ہوئے

سارنڈا ترے جنگل
ایک نرالی دنیا کا
بے مثل نمونہ ہیں
ترے جنگل اتنے گھنیرے ہیں
ہر لمحہ آگ اگلتے سورج کی
جھلساتی کرنیں بھی
پتوں سے، شاخوں سے ہو کر
دھرتی کے لمس کو حاصل کرنے میں
ناکام ہی رہتی ہیں
ترے جنگل اتنے سہانے ہیں
ہر لمحہ نظر کو خیرہ کر دینے والی ہریالی
چاروں اور نظاروں کو

* جھارکھنڈ کا جنگلی علاقہ جہاں نکسلی حملہ آوروں نے اپنے ٹھکانے بنا رکھے ہیں۔

دیوانہ کر دیتی ہے
جنگل کے پیڑوں پر
جنگلی پھولوں کی اس برسات سے
دل جھوم اُٹھتا ہے
اور اگلے پل
ذہن میں اک البیلی سی
خواہش بھی پلنے لگتی ہے
کاش یہ سارنڈا کے جنگل
جسم کو، ذہن و دل کو
اپنے فطری حسن سے
ہریالی سے
خاموشی کی دولت سے
معمور کریں
کہیں کسی کونے میں
اک چھوٹی سی کٹیا مل جائے
اور خاموشی سے
فطرت کا ہر حسن نمایاں ہو جائے
تبھی اچانک جنگل میں

پھولوں کی خوشبو کے بدلے
بارود کی بو تیز ہوتی ہے
اور اگلے ہی پل
ہرے بھرے سارنڈا کے جنگل جلنے لگتے ہیں
خوف کے سائے موت کا تانڈو کرنے لگتے ہیں

●

جنگل کی صدا

تعجب ہے ابھی تک ذہن میں
جاگیرداری کا نشہ چھایا ہوا ہے
تم نے جنگل روند ڈالے
اور بندوقوں سے اپنے
شوق کی تکمیل کر کے
فخریہ انداز میں
مہمان خانوں کو سجایا
جسم کے اعضا کی
بے ہنگم نمائش کو
ضرورت سے زیادہ اہمیت دی
اور اپنی چودھراہٹ پہ
بہت اترائے پھرتے ہو
تمہیں جاگیرداری کے نشے کا زعم ہے
سب ٹھیک ہے

لیکن نشہ آخر نشہ ہے

ٹوٹ جاتا ہے

تمہارا ابھی نشہ کافور ہوگا

جلد ہی تم بھی حقیقت جان جاؤ گے

مگر افسوس بس یہ ہے

کماں سے تیر کب کا جا چکا ہوگا

ابھی بھی وقت ہے

تم شوق سے معیار کو تبدیل کر لو

جنگلوں کو روندنا چھوڑ دو

کسی صورت بھی جنگل واسیوں کو

اپنی فطری زندگی بھرپور جینے دو

●

جنگل کی لکڑیاں

پہاڑی راستوں پر
لکڑیوں کی گٹھریاں سر پر سنبھالے
جا رہا ہے آدی واسی عورتوں کا قافلہ
یہ قافلہ کچھ دور جا کر
گاؤں کے بازار میں ٹھہرے گا
اور پھر لکڑیاں سر سے اُتاری جائیں گی
خوب صورت جنگلوں سے کاٹ کر
لائی گئی یہ لکڑیاں
بازار کی زینت بنیں گی
لکڑیوں کا بوجھ ڈھو کر
لانے والی عورتیں
خاموش رہ کر
دل ہی دل میں
اپنے ہٹے کٹے مردوں کی

جواں مردی کے نغمے گائیں گی
اور گاؤں کے بازار سے کچھ دور
ان کے مرد
اپنی تیز کلہاڑی سے
جنگل کا صفایا کرنے میں
مصروف ہوں گے
یہ وہی جنگل ہے جس کا حُسن
قائم تھا انھیں شیدائیوں سے
ذرّے ذرّے میں
اسی جنگل کے گوشے گوشے میں
شیدائیوں کی روح بستی تھی
اسی جنگل میں ان کا جسم لاغر ہو چلا ہے
اور اپنی زندگی کو
باقی رکھنے کا یہی اک راستہ
ان کو نظر آیا ہے
جنگل ختم کر کے خود وہ جینا چاہتے ہیں
ہم ترقی کے ہزاروں دعوے
کرنے والے دانش مند
اندر سے بہت ہی کھوکھلے ہیں

●

جامن کا پیڑ اور گوریائیں

جامن کے پیڑوں پہ بیٹھی گوریائیں
بارش کی بوندوں کا لطف اٹھاتی ہیں
پکے ہوئے جامن پہ ٹھونگیں مارتی ہیں
کچھ کھاتی ہیں، کچھ کو کتر کے پھینکتی ہیں
خوب چہکتی ہیں اور شور مچاتی ہیں
بڑے مزے سے اپنا گیت سناتی ہیں
ہری بھری جامن کی گھنیری شاخوں کو
گوریائیں اپنا مسکن جانتی ہیں
کہیں بھی جائیں، یہیں لوٹ کر آتی ہیں
لیکن گوریائیں کتنی بھولی ہیں
انھیں حقیقت کا کوئی بھی علم نہیں
کل جب پیڑوں کا سوداگر آئے گا
اور بے دردی سے پیڑوں کو کٹوائے گا

گوریائیں آس پاس کے پیڑوں پر
دم سادھے بس سہمی سہمی آنکھوں سے
کیسے ہیبت ناک مناظر دیکھیں گی
چپکے چپکے خون کے آنسو روئیں گی

●

بارش کی بوندوں کا سنگیت

تمھیں کیا پتہ ہے
کہ بارش کی بوندوں کا سنگیت
کتنا مدھر ہے
تمھیں کیا پتہ ہے
کہ مٹی کی دیواریں
کھپریل کی چھت میں
کیا اثر ہے
بڑے ہوٹلوں میں
بڑے شوق سے تم نے
ایام اپنے گزارے
سکون اور مسرت کو پانے کی خاطر
بڑے شوق سے تم نے دولت لٹائی
یہ سب ٹھیک ہے، لیکن اتنا بتاؤ
خوشی کے، سکوں کے ذرائع

تمھیں کیا سکوں دے سکے ہیں
نفی میں اگر ہے
جواب اس کا تو پھر
مری بات مانو
کبھی اپنے گاؤں کی مٹی کی
آواز پر تم بھی لبیک کہہ دو
جو پشتینی گھر ایک مٹی کا
اب بھی سلامت ہے
کھپریل جس کی
ابھی بھی مکینوں کو
بارش سے محفوظ رکھ کر
غضب کا انوکھا سا سنگیت
تحفے میں دیتی چلی آ رہی ہے
تمہارے پریشان سے ذہن کو
اب ضرورت ہے اس کی
کبھی تم ادھر کا ذرا رُخ تو کر لو
تبھی جان پاؤ گے
مٹی کی دیواروں میں کیسی ٹھنڈک سماتی ہے

کھپریل کی چھت میں بارش کی بوندیں
جو پڑتی ہیں
دل کی گلی کس طرح گنگناتی ہے
تم بھی کسی طرح ان تجربوں کو
ضرور اپنے اندر اُتارو
کبھی تم بھی خوشیوں کا سنگیت سن لو
جو اَب تک نہ سن پائے ہو
گیت سن لو

●

یادوں کے گم شدہ جنگل

کبھی ہواؤں کا سرگم بھی گونجتا ہے یہاں
کبھی مہیب سے سناٹے سرسراتے ہیں
کبھی تو حال کی کڑواہٹیں سسکتی ہیں
کبھی تو بھولے ہوئے نغمے گنگناتے ہیں
دھیان میں بستا ہے یادوں کا خوش نما جنگل
کبھی سکڑتا ہے ایسے کہ ہول آتا ہے
کبھی یہ پھیلتا جاتا ہے خواب کی صورت
تصورات کا شیشہ بھی جھلملاتا ہے
یہ گم شدہ ہے، یہ بس دھیان میں ہی روشن ہے
یہ گزرے لمحوں کا بے مثل اک نشیمن ہے
اور اس کا نور تری ذات سے ہے وابستہ
اور اس کے عکس سے ظاہر ہے درد کا رشتہ
ترے ہی دم سے تو روشن ہے یہ گھنا جنگل
تری ہی یادوں سے قائم ہے گم شدہ جنگل

●

چمن کی سیر

دیر سے سو کے اُٹھوگی تو کہاں پاؤ گی
مجھ کو پانا ہو تو گلشن کی طرف صبح میں آؤ
پیڑ کے پتوں پہ اس وقت دکھائی دوں گا
کھلتے پھولوں کی جبینوں میں نظر آؤں گا
ادھ کھلے غنچوں میں پاؤ گی جھلک تم میری
کونپلوں میں بھی بکھرتا ہے مرے پیار کا رنگ
یہ جو مخمل سی ہری گھاس ہے چاروں جانب
ان میں بھی تم کو نظر آئے گا بس میرا وجود
ٹھنڈی ٹھنڈی سی جو بہتی ہیں ہوائیں اس دم
ان ہواؤں کی نمی میں بھی تو شامل میں ہوں
غور سے دیکھو تو ہر شے میں دکھائی دوں گا
بس یہی شرط ہے جب دیکھنا چاہو مجھ کو
پَو کے پھٹتے ہی چمن میں تمہیں آنا ہوگا
ورنہ ہر سمت جو بکھریں گی سنہری کرنیں
پھر تو تم چاہ کے بھی مجھ سے نہ مل پاؤ گی
ایک دن کے لیے کھو کر مجھے پچھتاؤ گی

وقت کی دھوپ

دل کے سونے سے آنگن میں
خوب جتن سے
اس نے ریتیلی مٹی کو
صاف کیا تھا
اور اُپجاؤ مٹی کا
اک ڈھیر لگا کر
اس میں البیلی خواہش کے
کچھ پودوں کو
اپنے لرزتے ہاتھوں سے
اپجاؤ مٹی کی تحویل میں دے کر
یک گونہ رات کی
لمبی سانسیں لیں تھیں
سونے پن کو
سندر سا اک روپ دیا تھا

یہ سوچا تھا

جب آئے گا وقت کا موسم

وہ امید کی چھاؤں میں ستائے گا

میٹھے میٹھے پھل کھائے گا

لیکن یہ معلوم کہاں تھا

وقت کی دھوپ میں تپ کر

پودے سوکھ بھی سکتے ہیں

ننھے منے آس کے تارے

ٹوٹ بھی سکتے ہیں

●

خزاں سے کہو

خزاں سے کہو
کچھ دنوں تک کسی بھی طرح
اس علاقے کا رُخ نہ کرے
اس علاقے کے ہر ذرّے ذرّے میں
انمول چاہت سمائی ہوئی ہے
محبت کی بارش میں
ہر شے نہائی ہوئی ہے
ابھی تو ہواؤں میں
حیرت زدہ تازگی ہے
ابھی تو فضاؤں میں
دل کے فصیلوں کو
نم کرنے والی نمی ہے
ابھی تو گلستاں سے
غنچے چٹکنے کی

دھیمی سی آواز آتی ہے
دل کش مناظر میں
تازہ گلابوں کی
خوشبو دمکتی ہے
پیاری سی کیاری میں
ننھے سے پودوں میں
ننھی سی کلیاں
ابھی گنگنائی ہیں
یہ ننھی سی کلیاں
بہت جلد خوش رنگ
پھولوں میں تبدیل ہوں گی
ابھی بس ذرا دیر پہلے
ملائم سی شاخوں میں
دل کش سی کونپل نے
انگڑائی لی ہے
خزاں سے کہو
کچھ دنوں تک کسی بھی طرح
اس علاقے کا رُخ نہ کرے

●

پہاڑی جھیل کی مرغابیاں

کچھ دنوں سے
اس پہاڑی جھیل کی مرغابیاں
بے حال پھرتی ہیں
نہ جانے کیا ہوا ہے
کس تفکر نے
سبھی مرغابیوں کو
ان کے فطری جوش سے
محروم کر ڈالا ہے
اب تک اس پہاڑی جھیل کی مرغابیاں
مانوس تھیں
ہر اجنبی سیاح سے
وہ جانتی تھیں
شہر کے ہنگاموں سے جب بھی اوب کر
سیاح آتے ہیں

تو اس دل کش پہاڑی جھیل سے
سیراب ہوتے ہیں
پہاڑی جھیل کی مرغابیاں
جب اپنے اطراف و جوانب دیکھتی تھیں
بھول جاتی تھیں
کہ ان سیاح لوگوں سے
بہت لمحاتی رشتہ بھی
نہیں بن پائے گا
لیکن وہ اپنا پیار، اپنی اُنسیت
ان پر نچھاور کرنے کو
بے تاب رہتی تھیں
مگر اس بار
کچھ تبدیلی، کچھ آلام کے آثار
ان مرغابیوں کے چہروں سے ظاہر ہیں
شاید ان بہت معصوم سی
مرغابیوں کے ذہن میں
اس تلخ سچائی نے آخر کار
دستک دے ہی دی

اس بار سیاحوں نے اپنے آپ کو
سیاح کے بدلے شکاری میں
بہت ترکیب سے
تبدیل کر ڈالا ہے
شاید اس لیے مرغابیاں
اب جھیل میں بے حال پھرتی ہیں
کبھی جن سے بہت مانوس تھیں
اب ان سے ڈرتی ہیں

●

تارو میری مدد کرو

آسمان کے جگ مگ کرتے تارو
میری مدد کرو
وہیں کہیں پہ
میری بھی قسمت کا اک تارا ہوگا
جو پتہ نہیں کیوں
گردش میں ہے
اک عرصے سے
اس کے جگ مگ روپ نے
میری ان آنکھوں کو
نور سے کیوں محروم رکھا ہے
پتہ لگاؤ
آخر میری قسمت کا وہ تارا
کیوں گردش میں ہے
سارے بنتے کام

اچانک بگڑ رہے ہیں
اپنے بھی بیگانے ہو کر
بچھڑ رہے ہیں
خزاں مکمل طور سے
دل پہ قابض ہے
پرچھائیں بھی
جسم سے رشتہ توڑ رہی ہے
حبس بہت ہے
گھٹن کی شدت کیسے کم ہو
مدد کرو
آسمان کے جگ مگ کرتے تارو
میری مدد کرو
مری قسمت کا تارا
گردش سے کیسے نکلے
میری مدد کرو

●

تباہی کا منظر

نگاہوں کے آگے، بہت دور تک
یہ جو گنجان آبادی جنگل کی صورت میں
پھیلی ہوئی ہے
یہاں چند برسوں ہی پہلے
حقیقت میں بے حد گھنا سا، بھیانک سا جنگل،
لیکن وہ جنگل بہت جلد ہی
ارتقا کے اندھیروں میں گم ہو گیا
بستیاں بس گئیں
شہر کے شہر آباد ہوتے گئے
ارتقا کی نئی منزلوں پہ قدم رکھ کے
انسان مسرور تھا
مگر باطنی جو حقیقت تھی
اس سے بہت دور تھا

اسے یہ کسی لمحے احساس بالکل نہ ہو پایا
جنگل تو خود اس کے اندر
بہت دور تک پھیلتا جا رہا تھا
تباہی کی ہیبت کا دل دوز منظر
قریب آ رہا تھا

●

کھلی فضا میں اڑنے والا

کمرے میں پھر حبس بہت تھا
بالکنی کی کھڑکی کھولی
تا کہ ہوائے تازہ کمرے میں داخل ہو
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ضرور آئی کمرے میں
لیکن ساتھ ہوا کے ایک پرندہ آیا
کھلی فضا میں اڑنے والا
کمرے کی مبحوس فضا میں آکر بے حد گھبرایا
اپنے پروں کے دم پر اس نے
کھڑکی سے باہر جانے کی کوشش کی
تبھی اچانک
وہ تیزی سے گھومتے
سیلنگ فین کی زد میں آبیٹھا

اگلے ہی پل تڑپ رہا تھا
لہولہان پروں میں کتنی شدت سے وہ تڑپ رہا تھا
اجلے اجلے فرش کی رنگت بدل گئی تھی
عقل یہ اک لمحاتی منظر دیکھ کے بالکل دہل گئی تھی

●

حبس سے نجات کی سبیل

گھٹا چھائی تھی لیکن
چار جانب حبس کا عالم تھا
ایسے میں ہوا بھی رُک گئی تھی
اور گھٹن بڑھتی ہی جاتی تھی
گھٹا جو دیر سے چھائی تھی لیکن
وہ کسی صورت
برسنے بھی نہ پائی تھی
مگر اک لمحے میں
تبدیل سب کچھ ہو گیا ہے
بادلوں کا شور بڑھتا جا رہا ہے
اب ہواؤں میں نمی آنے لگی ہے
وہ گھٹا جو دیر سے چھائی تھی
وہ کھل کر برستی جا رہی ہے
جس جگہ کچھ دیر پہلے حبس طاری تھا

وہاں موسم سہانا ہوگیا ہے
ایسی صورت میں
ہمیں بھی کچھ نہ کچھ
تو سیکھنا ہی چاہیے فطری مناظر سے
میری مانو
تم اندر کی گھٹن سے
حبس سے
باہر نکل آؤ
غبار آلود اپنے ذہن و دل کو
صاف کرنے کا یہی اک راستہ ہے
تیز بوچھاروں کی صورت
تم برس جاؤ
ذرا سی دیر میں
اندر کا موسم خود نکھر جائے گا
پھر باہر کی دنیا میں
دھنک رنگوں کا اک بے تاب منظر
ان نگاہوں میں سمائے گا

●

بارش اور دھول

فضا میں پھیل رہا تھا غبار چاروں طرف
حدِ نگاہ فقط دھول کے تھپیڑے تھے
یوں لگ رہا تھا کوئی بھی اماں نہ پائے گا
تباہ ہو کے رہے گا یہ کاروانِ حیات
مگر نظر میں سمایا عجیب نظّارہ
پلک جھپکتے ہی بادل کے جھنڈ آنے لگے
اور آسمان کے صحرا میں گل کھلانے لگے
پھر اگلے پل ہی گرج دار بارشوں کے طفیل
سلگتی مٹی سے سوندھی سی خوشبو آنے لگی
تو پھر نڈھال طبیعت بھی گنگنانے لگی

●

سمندر اور جزیرہ

سمندر ہر گھڑی بھوکا ہی رہتا ہے
نگل جاتا ہے وہ سب کچھ
کسی صورت جو اس کی زد میں آتا ہے
سمندر کی بلا خیزی کے آگے
سخت چٹانیں بھی ریزہ ریزہ ہو کر
چیختی چنگھاڑتی لہروں میں
زندہ دفن ہو جاتی ہیں
اس زندہ حقیقت سے
بہت اچھی طرح
واقف ہے چھوٹا سا جزیرہ
وہ جزیرہ تو بہت مشہور ہے
اپنی کشش کے واسطے، لیکن
سمندر کی ہلاکت خیزیوں سے
ہر گھڑی سہما سا رہتا ہے

نجانے کب
سمندر کی جنونی کیفیت کی
زد میں آ جائے
نجانے بھوک کی شدت میں
یہ پاگل سمندر
پُرکشش، شاداب سے
ننھے جزیرے کو نگل جائے

●

کوئی ضروری نہیں

جب سے نیلی چھتری والے نے
یہ جہاں بنایا ہے
وقت کے ساتھ اس کائنات کی
ہر شے میں تبدیلی نے دستک دی ہے
آج نگاہوں کو جو چیزیں
ہر لمحہ خیرہ کرتی ہیں
ان کی حقیقت اور ہی کچھ تھی
اور اب جو کچھ اپنی نظر کے قابو میں ہے
یہ آنے والے وقتوں میں
حیرت ناک تبدل کا مظہر ہوگا
گویا کہ ہر چیز تغیر کی زد میں ہے
لیکن یہ بھی سچ ہے
نیلی چھتری میں اب تک
کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے
اور نہ ہوگی

یہ بھی سچ ہے
چاند ابھی تک ویسا ہی ہے
اور ہمیشہ ایسے ہی وہ
آسمان پر اپنی کشش بکھیرے گا
تاروں کی بھی چمک میں کوئی
فرق نہیں آیا ہے
اور آئندہ بھی یہ چمک
کبھی معدوم نہ ہوگی
سورج اب بھی اسی تمازت کا
تحفہ لے کر وارد ہوتا ہے
اور دنیا کو روشن کرنے کا یہ تسلسل
اسی طرح آئندہ وقتوں میں بس یونہی جاری رہے گا
پھول کی خوشبو، ہوا کا سرگم
اور پرندوں کے یہ سریلے نغمے
یوں ہی گونجیں گے
وقت کے ساتھ بدلنا مجبوری ہے لیکن
کوئی ضروری نہیں ہے
ہر اک شے میں ہر لمحہ کوئی تبدیلی آئے
کوئی ضروری نہیں ہے تبدیلی کے عوض
اپنے اندر بھی ہر لمحہ تلخی آئے ●

تاریکی کا عذاب

چاروں جانب گھور اندھیرا
اپنی ہیبت ناکی ذہنوں پر
طاری کرتی جاتی ہے تاریکی
خاموشی کا راج ہے
دیکھا بھالا منظر یوں لگتا ہے
جیسے اَن دیکھا سا کوئی منظر ہے
آنکھیں زخمی
پاؤں بھی شل ہیں
پھر بھی مسلسل آگے بڑھتے جانا ہے
رُکے تو پتھر بن جانے کا خطرہ ہے
جسم کو حرکت میں رکھنا مجبوری ہے
طے کرنا ہے جو کچھ بیچ میں دوری ہے

●

گل اور بلبل کا قصہ

گل اور بلبل کے قصے میں
ایک انوکھا موڑ اچانک آیا ہے
بلبل نے خاموشی سے
تبدیل چمن کو کر ڈالا
اور دوسرے گلشن کے پھولوں سے
اپنا رشتہ جوڑ لیا ہے
گل بھی دوسرے بلبل کی قربت سے
شگفتہ اور شاداب نظر آتا ہے
سارا گلشن انجانی خوشبو کی زد میں رہتا ہے
بدلتا موسم دونوں کو حیرت سے تکتا ہے

●

تاثرات

''شام ہوتے ہی''

(مجموعۂ غزلیات ۲۰۰۷ء)

- تمہاری کتاب ''شام ہوتے ہی'' مجھے مل گئی اور میں تمہارے خط کا جواب بھی جلد ہی دینا چاہتا تھا، لیکن کتاب کو پڑھتا رہا اور سوچتا رہا کہ جس کتاب سے دن بہ دن لطف اندوز ہوتا رہا ہوں، اس کے ملنے کی رسید کی اطلاع دینا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ یقین مانو ایک مدت کے بعد غزلوں کی اچھی کتاب میسر آئی ہے۔ آج کل اتنی خراب شاعری ہو رہی ہے، نظم اور غزل میں کہ کسی کا ایک شعر دل کو چھوتا نہیں، لیکن تمہاری کتاب بس شوق سے پڑھتا رہا۔ بڑی بے تکلف اور برجستہ شاعری ہے۔ ایک فرحت ناک تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس تازگی میں حسن فطرت کا نکھار بھی شامل ہے۔ غزل میں فطرت پر اتنے اچھے اشعار ناصر کاظمی کے بعد تمہارے یہاں نظر آتے ہیں۔ پڑھتے وقت یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اس کتاب پر کچھ لکھنا چاہیے۔ خط کی تاخیر کا ایک یہ بھی سبب تھا کہ خط لکھوں یا تبصرہ لکھوں۔ تاثرات اتنے الگ الگ قسم کے ہیں کہ خط میں بیان نہیں ہو سکتے۔ میں تبصرے کے لیے کمٹ منٹ نہیں کرتا کیوں کہ مجھ پر کام کا بوجھ سرِ دست بہت زیادہ ہے، لیکن اتنی اچھی شاعری پر ذمہ داری سے کچھ نہ لکھنا بھی فرضِ ناشناسی معلوم ہوتا ہے۔

—— وارث علوی

- میاں تم شعر تو عمدہ کہتے ہو۔ ''نیا سفر'' میں تمہاری جتنی غزلیں بھی میں نے شائع کیں ہیں، ان میں ایک خاص تیور واضح پر دکھائی دیتا ہے۔ ''شام ہوتے ہی'' میں تمہارا مخصوص تیور، تمہاری مخصوص شناخت کے طور پر اُجاگر ہوتا ہے، لیکن تم اس تیور میں

توازن کا عنصر ضرور شامل رکھنا۔ اس طرح تمہارے لہجے کی کاٹ برقرار رہے گی۔ مجموعے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم نے کچھ غزلیں مشہور شعرا کی زمینوں میں کہی ہیں۔ اتفاق سے میں نے بھی ان زمینوں میں کچھ اشعار کہے تھے۔ گویا کہ تمہاری کچھ غزلیں پڑھ کر میرے ذہن میں ماضی کے کئی اوراق روشن ہو گئے۔ اپنی کہی گئی کچھ غزلیں اسی مناسبت سے یاد بھی آئیں۔ پرانی بات ہوگئی۔ اب حافظہ ساتھ نہیں دے رہا ہے ورنہ میں کچھ اشعار یہاں ضرور پیش کرتا۔ بہرحال مجموعے کے ذریعے تمہارے اندر کے توانا شاعر سے ملاقات ہوئی۔ بہت اچھا لگا۔ تمہیں لفظوں کو برتنے کا سلیقہ خوب آتا ہے۔ تمہاری ردیفیں بھی بہ طور خاص متاثر کرتی ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ ''نیا سفر'' میں اس پر تبصرہ آجائے۔

—— قمر رئیس

- موجودہ دور کی غزلوں میں راشد کے احساسات کی ایک خاص ڈگر محسوس کی جاسکتی ہے۔ کہیں کہیں چونکانے کا انداز بھی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ راشد روایت کو نہیں بھولتے۔ ان کے یہاں جدت طرازی برائے جدت طرازی نہیں ہے بلکہ اپنے مطالعے کی روشنی میں انھوں نے جو کچھ سیکھا ہے اسے نئے انداز سے پیش کرنا جانتے ہیں.... میں سمجھتا ہوں راشد کے یہاں زندگی کے بہت سے مسائل بار پاتے رہے ہیں۔ شاعر ایسی تمام سطحوں کو چھونا چاہتا ہے، محسوس کرنا چاہتا ہے اور اپنی ذاتی فکر میں ان کی نوعیتوں کو سمیٹنا چاہتا ہے۔ راشد انور راشد کا حلقۂ فکر وسیع ہے تو صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ کسی ایک تصور میں بند نہیں۔ زندگی کی بیکرانی چاہے وہ کسی سطح کی ہو، چاہے وہ جتنی بھی عمومیت رکھے، یکسر نظر سے اوجھل نہیں ہوسکتی۔ اگر شاعر جوہر تخلیق سے آراستہ ہے اور کی نظریں بھی وا ہیں تو پھر اس کا حلقہ محدود نہیں ہوسکتا۔ راشد کے یہاں موضوعات کا تنوع ان کے وسیع دائرے سے مملو ہے جس میں افکار یک نہج نہیں ہیں بلکہ جن کی نوعیتیں مختلف ہیں۔

—— وہاب اشرفی

- میں تمہاری شاعری کا شروع سے قائل رہا ہوں۔ تمہیں یاد ہوگا جب تم نے جے این یو میں داخلہ لیا تھا، اسی دوران تمہاری ایک غزل رسالہ ''راشٹریہ سہارا'' میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے فوراً بعد جب تم سے گھر پر ملاقات ہوئی تو میں نے کافی دیر تک اسی غزل پہ بات کی تھی۔ کسی کی صلاحیت کا اندازہ چند غزلوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ویسے تمہاری شاعری تو میں اور پہلے سے بھی مختلف رسائل میں پڑھتا رہا ہوں۔ اب مجموعے کی صورت میں ڈھیر ساری غزلیں نظروں سے گزر رہی ہیں تو حیرت انگیز خوشی ہو رہی ہے۔ ان دنوں تمہارے مضامین بھی تواتر کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں، لیکن بنیادی طور پر تم ایک شاعر ہو۔ ایک ایسا شاعر جو اپنی شاعری کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں آسانی سے جگہ بنا سکتا ہے۔ مجھے لگتا ہے تم بانی سے زیادہ متاثر ہو۔ عرفان صدیقی بھی تمہارے پسندیدہ شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ حد تک دونوں کا اثر قبول کرتے ہوئے بھی تم نے اپنی الگ راہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ ان دنوں طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی، لہٰذا سرِ دست اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔

  —— مظہر امام

- آپ کی چٹھی اور شاعری کی کتاب ''شام ہوتے ہی'' (کتنا اچھا نام ہے) ملی۔ شکریہ! میں نے آپ کا کلام بڑی دلچسپی سے پڑھا ہے۔ میری دلچسپی کا ایک نمایاں سبب یہ بھی تھا کہ آپ کی شاعری انسانی معمول کی وارداتوں پر مشتمل ہے۔ اس لیے آپ کا قاری، آپ ہی آپ آپ کی تخلیقات میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ شعری خطوط کسی فن کار کی ہنرمندی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ آپ اور بھی مہارت سے اپنی اس خوبی کو اُجاگر کریں گے۔

  —— جوگیندر پال

- ''شام ہوتے ہی'' کی صورت میں ایک بے حد خوب صورت تحفہ دستیاب ہوا۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ آپ کی شاعری میں اچھی شاعری کے تمام امکانات پوشیدہ ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ نئی نسل میں آپ کا نام بے حد نمایاں ہے۔ زبان کے مخصوص

معیار کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے آپ نے لسانی کرتب بازیوں سے گریز کیا ہے۔ ترسیل کی سطح پر بھی ایک خوش گوار تاثر ذہن ودل کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ فکر اور فلسفے کے بجائے مخصوص کیفیات اور جذبات کو نظم کر کے تخلیقی سطح پر زیادہ طمانیت محسوس کرتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ وادیٔ شعروادب میں آئندہ بھی اسی طرح خوش رنگ گل بوٹے کھلاتے رہیں گے۔

—— مخمور سعیدی

- ''شام ہوتے ہی'' آپ کی کتاب ملی۔ یاد کرنے کا شکریہ۔ آپ کے ساتھ علی گڑھ میں اچھا وقت گزرا تھا۔ اس کی خوشبو یادوں میں اب تک ہے۔ آپ کی کتاب نے اس خوشبو کو اور گہرا اور تازہ کر دیا۔ آپ کی تحریرات رسائل میں پابندی کے ساتھ دیکھنے کو مل جاتی ہیں، لیکن کتاب میں بکھری ہوئی تخلیقات کی یکجائی کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ آپ کی شاعری، دل کے تاروں کو چھیڑنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ لہجے کی غنائیت، الفاظ کی جادوگری کو مزید نمایاں کرتی ہے۔ دعا گو ہوں، خدا آپ کے تخلیقی ذہن کو یوں ہی فعال اور روشن رکھے۔

—— ندا فاضلی

- جدید شاعری کے حسی اور ہیئتی منظر نامے میں راشد انور راشدؔ کی شاعری ردو قبول کے پیش منظری تسلسل میں اپنی نمایاں اور منفرد خصوصیت رکھتی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں اپنے گردو پیش کے محاکمہ میں جس تخلیقی دروں بینی سے کام لیتے ہیں وہ بہ طور خاص اس بات کی غماز ہے کہ ان کی دسترس جذبات واحساس کی شائستگی اور سعیِ کاوشِ مدام کی وجودیت پر نہ صرف اظہار آمیز بلکہ فراز قدر بھی ہے۔ وہ اپنی ذات کے آئینہ میں اک وجدانی کیفیت کے ساتھ دوسروں کے معاملاتِ خوش آئند کی استعاراتی تفہیم میں بھی کوشاں نظر آتے ہیں جو اس بات کا بھی اشاریہ ہے کہ تجربہ ان کے ہاں نہ صرف تخلیقی سطح پر بلکہ رمز کی کارفرمائی کے طور پر بھی جلوہ آشنا ہے۔ راشد انور راشدؔ کے بہت سے اشعار لذت شرح بیانی سے معمور نظر آتے ہیں اور ان کا یہ وصف گویائی کے جوہر کا بھی

اشارہ واستعارہ ہے کہ یہ منزل بہت کم لوگوں کو ودیعت ہوتی ہے۔ یہ گوہر بے بہا بہت کم لوگوں کے ہاتھ لگتا ہے۔

—— کرشن کمار طور

- تمہارا شعری مجموعہ ''شام ہوتے ہی'' ملا۔ بے حد شکریہ! تمہاری نظمیں، غزلیں اور مضامین مختلف جرائد میں نظروں سے گزرتے رہے ہیں۔ تم ایک فعال قلم کار ہو۔ اردو شعر و ادب کو تم سے بہت فن تو قعات وابستہ ہیں۔ زیر نظر مجموعہ میں شامل ''اعتراف'' کے ذریعے تم نے اپنے مزاج، رویے اور نظریۂ فن کی بڑی عمدگی سے صراحت کردی۔ اپنی کتاب میں مشاہیر کی آرا (تمہارے الفاظ میں بیساکھیاں) کو شامل نہ کر کے تم نے اپنی فن کارانہ خود اعتمادی کا ثبوت دیا ہے۔ تمہاری خود اعتمادی انفرادیت کا رنگ لیے جگہ جگہ اپنا جلوہ بکھیرتی نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تمہاری شاعری ایک نئے محاورے کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ جگہ جگہ تمہاری غزلوں میں اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے، تاہم یہ صرف ایک جھلک ہے۔ البتہ تمہارے لہجے کی خود اعتمادی بتاتی ہے کہ بہت جلد تم اسے مکمل طور پر دریافت کرلو گے۔

—— سلام بن رزاق

- تمہارا مجموعہ صرف غزلوں پر مشتمل ہو اور تم جانتے ہو کہ میں نظم کا رسیا ہوں۔ پھر بھی ''شام ہوتے ہی'' کا مطالعہ میں نے شوق سے کیا۔ تمہارے بہت سے اشعار میں نظم کی کیفیت پوشیدہ ہے۔ یعنی اگر تم چاہو تو بہت سے اشعار کو نظموں کے سانچے میں ڈھال سکتے ہو۔ کبھی فرصت سے میری باتوں پر غور کرنا۔ یہاں میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ مستقبل میں جب کبھی تم نظم کہنے کی جانب مائل ہو گے تو تمہارا غزلیہ آہنگ ہی نظموں میں نمایاں ہوگا۔

—— صلاح الدین پرویز

- میں آپ کا کلام برابر مختلف رسالوں میں پڑھتا رہا ہوں، لیکن جب مجموعہ ہاتھ آیا اور میں ورق پر ورق اُلٹتا گیا تو ایسا لگا جیسے بوڑھی آنکھوں میں تارے جھلملا رہے ہیں اور

زندگی کی شام میں روشنی کی لو کچھ تیز ہو رہی ہے۔ کلاسیکی شعرا کے مطالعے اور اہلِ نظر حضرات کی صحبت نے آپ کو وہ نگاہ عطا کی ہے جو امتیاز وانفراد کی صلاحیت رکھتی ہے۔ آپ کی غزلیں ''باہمہ اور بے ہمہ'' کی عمدہ مثال ہیں۔ شعر کا کمال یہ ہے کہ وہ دل کو مسرت اور دماغ کو بصیرت سے ہم کنار کرے۔ آپ کے بیش تر اشعار اس کیفیت کے حامل ہیں۔ یہ آپ نے اچھا کیا کہ بیساکھیوں کا سہارا نہیں لیا اور اعتراف حقیقت کے ساتھ اپنی غزلیں پیش کر دیں۔ ''عطر آنست کہ خود بگوید نہ کہ عطار بگوید۔''

— علقمہ شبلی

• خوش ہوں کہ سرزمین علی گڑھ تمھیں راس آئی اور وہاں رہ کر اطمینان سے تم نے تازہ غزلیں بھی کہیں اور انھیں سلیقے سے ترتیب دے کر مجموعے کی شکل میں شائع بھی کر دیا۔ تمھیں شاعری اور نثر نگاری دونوں اصناف پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ میں تمہاری صلاحیتوں کا معترف ہوں۔ تم نے بہت کم مدت میں اپنی محنت شاقہ کے باعث اپنی الگ شناخت قائم کر لی ہے۔ تمہارا مجموعۂ غزلیات تمھیں شہرتِ دوام بخشنے کے لیے کافی ہے، کیوں کہ تمہارے بیش تر اشعار سینہ بہ سینہ سفر کرنے کی سکت رکھتے ہیں۔

— ظہیر غازی پوری

• راشد انور راشدؔ نئی نسل کے خوش فکر شاعروں میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ نئی شاعری میں جہاں بعض ناہمواریاں یا اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے شوق میں کرتب بازی بھی ہے، راشدؔ نے ان سے خود کو بہت زیادہ بچائے رکھا ہے۔ ان کی غزل پڑھیے تو اندازہ ہوگا کہ ہم نئی غزل پڑھتے ہوئے بھی کچھ اور پڑھ رہے ہیں۔ راشد اپنی آواز کو سنبھالنے اور اپنی انفرادیت کو بنائے رکھنے پر توجہ دیتے ہیں۔ وہ کہیں کسی کی تقلید کرتے نظر نہیں آتے، البتہ انھوں نے اردو غزل کی روایات، اپنے بعض پیش رووں اور اپنے ہم عصروں سے استفادہ ضرور کیا ہے۔ ''شام ہوتے ہی'' نئی غزل کا ایک خوب صورت لائق مطالعہ اور قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ نئی غزل کے اثباتی انداز اور اس کے خوش گوار پہلو آج جن شاعروں کے پاس روشن ہیں، راشدؔ ان میں سے ایک

ہیں۔ انھوں نے عام موضوعات پر اور عام انداز کے اشعار بھی کہے ہیں، لیکن ان کا پیرایۂ بیان ان کی انفرادیت کا پتہ دیتا ہے۔ راشد نے اس مجموعہ میں لفظ ''شام'' کو کئی اشعار میں استعمال کیا ہے۔ کہیں سیدھے سادے لفظ کے بہ طور اور کہیں تشبیہ یا استعارہ کی حیثیت سے۔ اس سے شاعر کے مزاج پر روشنی پڑتی ہے۔

—— سلیمان اطہر جاوید

- ''شام ہوتے ہی'' کو کئی بار پڑھنے کے بعد جو پہلا اور غالب تاثر پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا شعری کردار ایک بہت گہری بے دلی اور لاتعلقی کے عالم میں ہے۔ جیسے روح پر کوئی بہت بھاری بوجھ ہو، جو کسی صورت اُٹھائے نہ اُٹھتا ہو۔ اس بے دلی اور لاتعلقی کے عالم میں اندر ہی اندر ایک ہلکی ہلکی گریہ ناک صدا بھی سنائی دیتی ہے جو انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ اس لحاظ سے راشد انور راشد کی یہ شاعری ایسی تہذیب آشوب اور وجودی بحران سے کسبِ تکلیف اور فیضانِ تخلیق حاصل کرتی ہے جو صنعتی دور کی اُتھل پتھل کے بعد سے انسانی زندگی اور معاشرے کو درپیش ہے۔ یہ شعری کردار اپنے اندر اور باہر، اپنے گھر اور معاشرے، اپنے عشق اور بازار اور اپنے وجود کے درمیان ایک لازمی کشاکش سے دوچار ہے۔ ایک عام آدمی کی طرح اس نے بھی کچھ خواب دیکھے ہیں، کچھ آرزوئیں کیں ہیں، کچھ منصوبے باندھے ہیں، مگر یہ تمام وجودی انتخابات اس کے خارج کے جبر کے سامنے بے دست وپا نظر آنے لگتے ہیں۔

—— فرحت احساس

- راشد انور راشد کے پہلے مجموعۂ کلام ''شام ہوتے ہی'' جس میں سو سے زائد غزلیں شامل ہیں، پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ راشد نے سکہ بند موضوعات اور مروجہ لفظیات سے شعوری طور پر انحراف کر کے قاری کو حسیاتی سطح پر تخلیقی تازہ کاری کے نئے منطقوں سے روشناس کرایا ہے۔ راشد اشیا میں ظاہر یا مخفی مماثلتوں کو استعارہ یا تشبیہ یا metonomy کی وساطت سے پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں ایک نکتہ سے دوسرے نکتہ کی طرف جست میں حیرت انگیز تخلیقی سرعت کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کے اشعار کے

کئی دوسرے مصرعے تجربے کی عمومیت اور متوقع جہت کو خاطر نشان کرتے ہیں مگر مصرعۂ اولیٰ بیان کے غیر متوقع پن اور تخلیقی انفرادیت کو پیش کرتا ہے۔ جذبے کی وارفتگی کو الفاظ کی تخلیقی اور اندرونی توانائیوں کے انسلاکات کے ساتھ پیش کرنا راشدؔ کی شاعری کا مابہ الامتیاز عنصر ہے۔

—— شافع قدوائی

• گزشتہ کچھ برسوں میں جو تازہ سفری صلاحیتیں اُبھر کر سامنے آئی ہیں اور جو نئے نام ملک اور بیرون ملک کے مقتدر رسائل میں تواتر کے ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں، ان میں اگر بہت احتیاط کے ساتھ بھی چند ایک کا انتخاب کیا جائے تو راشد انور راشدؔ کے نام کی شمولیت ناگزیر ہی ہوگی۔ شعری تخلیق (غزل/نظم) کے علاوہ راشدؔ کے مضامین و مقالات اور بحث و گفتگو بھی ادبی رسائل کے ذریعے قارئین تک پہنچتی ہے۔ سمیناروں میں شرکت اور گاہے گاہے ان کی نظامت اس پر مستزاد ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ راشدؔ صرف ایک ہونہار ادیب و شاعر ہی نہیں بلکہ ادب کے ایک سنجیدہ اور وابستہ قاری بھی ہیں۔ ان کی شاعری میں ذہانت، صلاحیت اور تخلیقی امکانات کے مختلف پہلوؤں کو بہ آسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔

—— ساجد رشید

• راشدؔ کے پیمانۂ غزل میں صرف مادیت، ارضیت اور دھول مٹی ہی نہیں، وجدانیت بھی ہے، فکر و نظر کی رنگا رنگ اور بوقلمونی شعاعیں جا بہ جا عکس ریز دکھائی دیتی ہیں، حسن کے جلوے بھی ہیں اور عشق کی واردات بھی۔ کیفیت و کمیت کے اعتبار سے اور بھی بہت کچھ ہے لیکن قنوطیت نہیں ہے۔ رجائیت کی لہریں ہیں، کہیں دھیمی اور کہیں تیز۔ راشدؔ کی بعض غزلوں کے اشعار کی ساری زمینیں پامال کر ڈالی گئی ہیں۔ آج کا وہی شاعر کامیاب ہو سکتا ہے جو ان پامال زمینوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے حرف و لفظ کے نئے نئے گل بوٹے کھلا سکتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لیے محنت شاقہ کے ساتھ ساتھ حوصلہ اور ہنر مندی بھی چاہیے۔ راشد انور راشدؔ کے اشعار میں یہ خوبیاں

دکھائی دیتی ہیں۔ وہ آتش دان میں بھی خواہشوں کے پھول کھلانے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس لیے ان سے بہت ساری توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ آتشِ نمرود میں گلشنِ ابراہیم کی نمود حدودِ امکان سے پرے نہیں۔

—— منظر اعجاز

• راشد ان معدودے چند لوگوں میں ہیں جو ۱۹۸۰ء کے بعد پوری تابانی اور توانائی کے ساتھ ادبی افق پر وارد ہوئے ہیں۔ اس شعری تصنیف میں جو صرف غزلوں پر مشتمل ہے، جو امر فوری طور پر متوجہ کرتا ہے وہ موضوعات، خیالات اور محسوسات کا حیرت انگیز تنوع جو قدم قدم پر شاعر کے سوچتے، ٹٹولتے ذہن اور احساس کی رنگارنگی کا سراغ دیتا ہے۔ ظاہر ہے یہ مجموعہ چوں کہ نسبتاً دیر سے منظر عام پر آیا ہے اور شاعر کا تخلیقی سفر اس سے بہت پہلے سے جاری رہا ہے تو اس میں شامل غزلیں بہت حد تک چھنی چھنائی ہیں۔ لہٰذا توازن، اعتدال اور قرینۂ ادائیگی کے مستحسن پہلوان سے برآمد ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر ''شام ہوتے ہی'' حال ہی میں شائع ہوئے غزلیہ مجموعوں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی سکت بھی۔ یہ اس کا حق بھی ہے جو قارئین اور ناقدین کی کماحقہ اعتنا کی شکل میں اسے ملنا چاہیے۔

—— عبدالاحد ساز

• آپ کی شاعری اور مضامین رسائل وغیرہ میں پابندی سے پڑھتا رہا ہوں۔ اب مجموعہ ہاتھ آیا ہے تو آپ کا کلام یکسوئی سے پڑھنے کا موقع ملے گا۔ آپ کی شاعری پڑھتے ہوئے ایک عجیب طرح کی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ کے ہاتھوں میں لفظ موم کی طرح نرم اور برف کی طرح شفاف ہو جاتے ہیں اور معنی کا درپن سامنے آجاتا ہے۔ نئی نسل کے شعرا میں آپ یقیناً ایک نہایت اہم نام کی حیثیت سے شمار ہوتے ہیں۔

—— نورالحسنین

• ۱۹۸۰ء کے بعد جن غزل گو شاعروں نے اپنی شاعری کی شناخت کے لیے نئی طرز، نئے معیارات، نئی فکر اور نئے رجحانات کی تلاش میں اپنی فنی اور لسانی بصیرت سے کام لینا شروع کیا ان میں راشد انور راشد کا نام قابلِ ذکر ہے۔ راشد ایک ایسے شاعر ہیں

جن کے یہاں فنی اور سماجی شعور دونوں کو بروئے کار لاکر اپنے عہد کے اجتماعی احساسات و جذبات کی نمائندگی کا پورا اہتمام نظر آتا ہے۔ ان کی غزلیں ایک ایسے جہانِ فکر کی جزئیات پر مشتمل ہیں جہاں آئینِ فن کی جلی شقوں میں تخلیقی اقدار کے لیے سماجی اقدار سے اخذ و استفادہ کرنا اور اسلوبِ بیان کی سلاست، صلابت اور شفافیت کے لیے قابلِ فہم ہونا اہم شرط تسلیم کی گئی ہے۔ راشد ان امتیازی شعرا میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جن کی طرزِ فکر اور پیرایۂ اظہار نے موجودہ غزل کے لیے تخلیقی ضابطوں کو مرتب کرنے کے لیے اپنی تخلیقی بصیرت سے کام لیا۔

— شفق سوپوری

- راشد نے یادوں کو اور محبوب کے عکسِ گم گشتہ کو اپنے تحت الشعور کا حصہ بنائے رکھا۔ خواب و خیال اور قرب و بُعد کے ذکر سے بھی دراصل اسی ماضی کا عکس بن کر اُبھرتا ہے۔ وفورِ عشق اور جذباتِ خالص باہم مل کر شعری پیکر میں ڈھلتے ہیں تو انسانی روح کو طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ راشد انور راشد نئی نسل کے ایک اہم شاعر ہیں۔ انھوں نے بھی نشانِ شعر کو چھونے کی کوشش کی ہے۔ ایک طرح کی سبک خرامی ہے جو اپنے جلو میں محبت اور جذبات کی تیز رو آندھی کے لیے سفرِ حیات طے کر رہی ہے۔ یعنی یہ جملہ راشد کی غزلیہ شاعری کے لیے ہے کہ انھوں نے شدت جذبات کو بھی غزل کے پیکر میں سبک بنانے کا کام کیا ہے۔ ایسا تب ہوتا ہے جب شاعر ٹھوس مضامین سے زیادہ کیفیت پر اپنی بصیرت کو مرتکز کرتا ہے۔ میرے نزدیک راشد نے اپنی بساط بھر اس طرف توجہ کی ہے۔

— کوثر مظہری

- راشد انور راشد نئی غزل کے نئے استعارے کی حیثیت سے افقِ شاعری پر اُبھرے ہیں۔ انھوں نے شاعری میں اپنے کمالِ فن کا بھرپور جوہر دکھایا ہے۔ راشد کی شاعری نہ صرف سازِ دل کے تاروں کو چھیڑتی ہے بلکہ ذہن کو دعوت غور و فکر بھی دیتی ہے۔ عام لفظوں میں شاعرانہ افق و کشش پیدا کرنے کا سلیقہ ان کے خلاقانہ ذہن کی غمازی کرتا ہے۔ راشد کا طرزِ سخن ایک بڑی شاعری کے روشن امکانات کی بشارت دیتا ہے۔ ان کے اشعار نئی حسیت اور تازہ کاری سے ہم آمیز ہو کر مفاہیم کے نت نئے گوشے اجاگر

کرتے ہیں۔ اپنے شعری سفر میں وہ آنسوؤں کی نمی کو بھی مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید کہتے ہیں اور زندگی کے متنوع پہلوؤں کو اپنی بصیرت کی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

—— عاصم شہنواز شبلی

- ''شام ہوتے ہی'' کی قرأت سے مجھے اس میں ایک ایسا شاعر نظر آیا جس کے ذہن میں دنیا، دنیا کے رشتوں کی نزاکتوں اور اپنے عہد کو سمجھنے کا جنون ہے۔ راشد کی غزلیہ شاعری میں رومانی عشق کے بجائے اکیسویں صدی کا ایک ایسا انسان یا عاشق نظر آتا ہے جس کی شام میرؔ کی یاد تو دلاتی ہے، لیکن یہ میرؔ کے زمانے سے بہت مختلف دنیا کی شام ہے جہاں زندگی کے جھمیلوں سے گزر کر ایک فرد گھڑی بھر کے لیے خالی وقت میں اپنے محبوب کو بھی یاد کر لیتا ہے۔ ''شام ہوتے ہی'' کی غزلیں دراصل مابعد جدید ذہن کا شعری پیکر معلوم ہوتی ہیں جہاں کسی قسم کی تحدید یا روک ٹوک یا پابندی یا لیک پر چلانے کی روش کے خلاف فنی احتجاج کیا گیا ہے۔ راشد اس مجموعے میں معنی آفرینی کے بجائے کیفیت کے شاعر زیادہ نظر آتے ہیں لیکن ان میں ایک معنی آفریں اور صاحبِ اسلوب شاعر بھی کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا ہے۔

—— مولا بخش

- راشد ایمائی لہجے کے شاعر ہیں۔ ان کا شعری اظہار کبھی بہت زیادہ open یا loud نہیں ہوتا۔ ان کی شاعری پر اشاریت اور ابہام کی ہلکی سی چاندنی بچھی ہوتی ہے۔ ان کی غزلیں فقط جذبات یا تاثرات کو ہی ظاہر نہیں کرتیں بلکہ زندگی کے رموز و نکات سے بھی مملو نظر آتی ہیں۔ ان کا کلام ہندوستانی مزاج کے بنیادی میلان کا غماز ہے۔ ''شام ہوتے ہی'' کی غزلوں میں دل فریبی اور جگر برشتگی میں بھی اعتدال ملتا ہے۔ ان کے عشق میں نشاط و سرمستی بھی ہے اور راز و نیاز کا گہرا رنگ بھی۔ ان کا شاعرانہ احساس پُر اسرار ہے۔ وہ جب اپنے حسی تجربے کو جذبے میں پروتے ہیں تو وہ سوز دروں کا حصہ بن جاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑتی دکھائی دیتی ہے۔

—— مشتاق صدف

ooo

''کہرے میں اُبھرتی پرچھائیں''

(عشقیہ نظمیں: ۲۰۱۲ء)

- گزشتہ دنوں میں نے راشد انور راشد کی ایک کتاب ''کہرے میں اُبھرتی پرچھائیں'' پڑھی اور اس پر اپنی رائے کے اظہار کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کتاب کی پہلی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ شروع سے آخر تک ایک افسانے کی طرح مربوط ہے۔ یعنی اگر یہ کہا جائے کہ پوری کتاب ایک تھیم پر لکھی گئی ہے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ ابتدائیہ بھی ہے، نقطۂ عروج اور اختتامیہ بھی ہے۔ آج شاعری کی جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں، وہ محبت کے موضوع سے محروم نظر آتی ہیں، جیسے آج کی نسل عشق کرنا بھول گئی۔ اگر ایسا ہے تو یہ انتہائی افسوس ناک ہے اور اگر عشق پر لکھنے کی توفیق نہیں ہے تو اس سے زیادہ افسوس ناک بات ہے۔ راشد کی پوری کتاب عشق پر مبنی ہے۔ کہیں غم روزگار کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ کہیں کہیں غم روزگار کی ایسی جھلکیاں نظر آتی ہیں جو فطری ہیں اور ضمنی ہیں۔ اس لیے نا قابلِ اعتنا نہیں۔

—— قاضی عبدالستار

- آپ کا تازہ شعری مجموعہ ''کہرے میں اُبھرتی پرچھائیں'' ڈاک سے نسبتاً جلد ہی مل گیا۔ اس میں شامل کچھ نظمیں جب رسالوں میں پڑھی تھیں تو لگا تھا کہ عنفوانِ شباب کا جذباتی اُبال ہے جو شعر کہنے کی توفیق رکھنے والے ایک نوجوان کی ڈائری میں خوشبو کی صورت میں مہکتا رہ گیا ہے۔ اب جو نظموں کو جستہ جستہ ایک تسلسل کے ساتھ پڑھا تو رائے بدلی اور احساس ہوا کہ دراصل یہ ایک ایسا عشقیہ اوپیرا ہے جس میں عاشق کسی رومانی کہانی کو سناتا ہوا ہجر و فراق، تنہائی، بدخوابی اور چاک دامانی سے اَن گنت

ساعتوں اور کیفیات سے گزرتا ہوا کسی خوش جمال اور پیکر ناز کو اپنی آنکھوں میں مجسم کرلیتا ہے۔ ان کیفیات میں جو شعر رنگ بھرتے ہیں تو فضا کہرے میں ڈوبی ہوئی لگتی ہے اور ایک سراپا ہوا کی خوب صورت رہگواروں میں ڈوبتا اُبھرتا محسوس ہوتا ہے۔ آپ نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ عنوانات کے بغیر بھی اسے ایک طویل رومانی قصے کے طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ میں نے جب اس شعری کاوش کو تسلسل میں پڑھا تو مجھے لگا کہ میں اس قصے کا ناظر بھی ہوں اور یہ کچھ عاشق کے شعری بیانیے کے ساتھ وژول اور ''خوابی رنگ منچ'' کے حوالے سے میری آنکھوں میں تیرنے لگا ہے۔ اس پورے اسکرپٹ کو اگر کوئی ذہین ''رنگ کرمی'' (تھیئٹر والا) اپنے طور پر اسے اوپیرا کی صورت اسٹیج کرنے کی فن کارانہ کوشش کرے تو اس پورے شعری بیانیے کے لکھے جانے کا جواز پیدا ہو جائے گا۔ اردو میں اس طرز کی طویل نظم نہیں تھی جس میں عشق کا آغاز ہے، عاشق کا جنوں ساماں اضطراب ہے، وصال کی راحتوں کو پانے کی گرم جوشی ہے، زمانے کی رقابت ہے اور پھر کسی اور کے منظور نظر بننے کی الجھنیں ہیں، گھر بار ہے، نوزائیدے کی آمد ہے، یہ سارا کچھ اسٹیج کیے جانے کے امکان سے بھرپور ہے۔ ایسا میرا تاثر ہے۔ آپ نے بھلے ہی ایسا نہ سوچا ہو، مگر کچھ صفحات پڑھنے کے بعد لگا کہ آپ نے اسے انجانے میں اوپیرا کے فارمیٹ میں لکھ دیا ہے۔ اردو میں اس نوعیت کا شعری بیانیہ نہیں ہے۔

—— زبیر رضوی

- کہرا اور پرچھائیں انسان کی باطنی دنیا کی پُراسراریت کو واضح کرنے کے لیے انتہائی موزوں ترین images ہیں جو ایک معتبر فن کار کے حس ادراک کا آئینہ دار ہیں۔ یہاں تمناؤں کی تلملاہٹ، آرزوؤں کی کسمساہٹ، خواہشوں کی کلبلاہٹ کو شعری پیکر میں تراشنے کی فن کارانہ کاوش نمایاں نظر آتی ہے جس کی ترسیل کی نارسائی پر قدغن لگانے کے لیے شگفتہ بیانی کو بروے کار لایا گیا ہے۔ جذبات، احساسات اور خیالات کی فراوانی کبھی کبھی بلندی سے گرتے ہوئے اس آبشار کی مانند ہوتی ہے جہاں تشنہ

ہاتھوں کا کشکول پانی کی روانی کی تندی کو گرفت میں لانے سے قاصر نظر آتا ہے۔ یہ ہی وہ پُر اسرار تجربہ ہوتا ہے جس کو تخلیق کار کبھی پرچھائیں، کبھی دُھند اور کبھی کہرے میں ملفوف پاتا ہے۔ شگفتہ بیانی اور سلاست شعری تخلیق کے حسن میں غیر معمولی کشش پیدا کرتے ہیں اور قاری کو ایک نئی انجانی کیفیت سے شرابور کرتے ہیں کیوں کہ جذبہ کی صداقت شگفتگی سے اس طرح نکھرتی ہے جیسے شبنم چٹکتی کلیوں پر بوچھار کرتی ہے۔ تخلیق کا محرک دراصل درونی تجربہ کی وہ انجانی کیفیت ہوتی ہے جو ظلمت کدۂ خاک میں نشو ونما کے لیے دانۂ گندم کو بے چین و بے قرار رکھتا ہے۔ راشد انور راشد کی شعری کہکشاں میں یہ کیفیت بہت نمایاں ہے۔ ان کی شعری کائنات میں ایک انتہائی پُر خلوص لگن اور دیانت دارانہ خود سپردگی واضح طور پر نمایاں نظر آتی ہے۔ ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا، کوئی خیال، کوئی جذبہ، کوئی احساس اچانک ذہن کی راہ داری میں گردش کرنے لگا۔ لفظوں کی تلاش میں، پیرہن کی تلاش میں، پیکر کی تلاش میں اور ان ہی لمحوں میں ادراک کے جھروکوں سے اظہار کے خوشے اُبھرنے لگتے ہیں۔ اسی کو تخلیق کا کرب بھی کہا جاتا ہے۔ اندرونی دنیا میں ایک خلفشار برپا ہوتا ہے جو بس اظہار چاہتا ہے۔ یہاں سلیقہ یا قرینہ تخلیق کار کی فن کارانہ صلاحیت کو پرکھتا ہے تاکہ اظہار کی ترسیل میں کوئی لکنت نہ رہے۔ خاص طور پر نظم اپنے دروبست میں ایک خاص انتظام کی متقاضی ہوتی ہے۔ یہاں تسلسل کے ساتھ ساتھ زیریں آہنگ کی اہمیت کو اس فن کاری سے گوندھنا پڑتا ہے کہ کہیں مغائرت کی جھلک بھی نظر نہ آئے۔ راشد انور راشد نے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ان کی نظموں کا ایک انفرادی pattern ہے۔ اس شعری مجموعہ کے کینوس پر صرف عشق و محبت کی واردات یا ہجر و وصال کے معاملات کی عکاسی ہی موجود نہیں ہے بلکہ زندگی کے ان تعمیمی تجربات کا عکس بھی نمایاں ہے جو روز و شب کی سطح سے اُبھرتے اور بدلتے موسموں سے ہم آہنگ ہو کر مختلف موڈ اور کیفیات کو جنم دیتے ہیں۔ انسانی رشتوں کی گوناگوں اور ان کا باہمی تفاعل راشد کے شعری اسلوب کا مخصوص نقطۂ ارتکاز ہے۔ رشتے چاہے سماجی سطح پر ہوں یا رومانی کیفیت کے حامل ہوں، خود بخود نغمگی میں ڈھل جاتے ہیں۔ ان رشتوں کے مختلف النوع

ذائقوں کا احساس تقریباً ہر نظم سے اُبھرتا ہے۔ ذہنی کیفیتوں کا رنگارنگی کے اظہار کے لیے اسلوب میں بھی تنوع آجاتا ہے جو بیانیہ، خطابیہ، استعجابیہ اور مکالمہ بن کر شعری پیکر میں مزید نکھار پیدا کر دیتا ہے۔ راشد کی نظموں میں جو آگہی موجود ہے وہ ان کی اپنی حقیقت پسندی کا خوب صورت عکس ہے۔ ان کی اس شعری کہکشاں میں ان کے انفرادی تجربات کے مدوجزر کا جو سرگم اُبھرتا ہے وہ قاری کے دل کے کسی نہ کسی گوشہ کی مترنم آواز ہے۔

—— سید امین اشرف

''کہرے میں اُبھرتی پرچھائیں'' راشد کی مربوط نظموں کا داستانی مجموعہ ہے۔ داستانوی ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ حسن وعشق کی سحر خیز حکایت ہے۔ یوں تو اس مجموعۂ شعری میں مختصر مختصر ۱۳۸ نظمیں شامل ہیں جن کے عنوانات قائم کیے گئے ہیں، لیکن عنوانات کے بغیر بھی ان نظموں سے کیف وانبساط میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ عشق کی جوت جگاتی راشد کی بظاہر غیر آرائشی نظمیں ہمارے دامنِ دل کو تھام لیتی ہیں کہ ان کی بے ساختگی حیران کن ہے۔ شاعر اپنی ذات کا سراغ پانے کے لیے مسلسل جستجو اور تلاش کے عمل سے گزر رہا ہے کہ عرفانِ ذات ہی منتہائے کمالِ عشق ہے۔ شفق کی سرخی سے یادوں کے کینواس پر لفظوں کو مصور کرنے والے شاعر راشد انور راشد نے ''کہرے میں اُبھرتی پرچھائیوں'' کو نہایت ربودگی اور شگفتگی کے ساتھ اپنی منظوم داستانِ محبت کے پیکر دل نشیں میں ڈھالا ہے۔ پہلے عشق کی پرچھائیں تو چھلاوے کی طرح زندگی بھر ہمارا پیچھا کرتی رہتی ہے اور یوں بھی زندگی کی حقیقتوں کا سراغ پانے کے لیے عشق دریا میں ڈوبنا اور اُبھرنا ہی عاشق کا مقدر رہے۔ راشد کی نظم ''عشق نامہ'' ہم پر منکشف کرتی ہے کہ عشق غیر مشروط ہے، محبوب کی لاحاصلی میں حاصل کا لطف ہے۔ کتاب عشق کا درس لینے والا دنیا کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔ شاید اسی لیے عشق کو لذتِ آزار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ راشد کی کتاب عشق، نئے عہد نامے کی دہلیز پر سوغات ہے جو ہمارے آتش شوق کو بھڑکاتی رہے گی، ہمیں عشق کے لیے آمادہ کرتی رہے گی کہ عشق ہی ایسی عبادت

ہے جس سے ہمارا تزکیۂ نفس ہوتا ہے۔ یہ ہمیں پاکیزہ بناتا ہے۔ عشق کی پل صراط سے گزر کر ہی مرنے میں ہم جینے کا مزہ پاتے ہیں۔ راشد نے خوابوں کے جو حسین پھول کھلائے ہیں، ان کی خوشبو تادیر چمنِ اردو کو سرشار کرتی رہے گی۔ ان کی شاعری گرمیٔ جذبات کے شدید احساس سے مرصع ہے۔ وہ اپنے اظہار و اسلوب کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں میں بے حد نمایاں ہیں۔ انھوں نے نئی نظم کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ان کی نظموں میں غیر شعور طور پر لمسیاتی اور حسیاتی دنیا کے رنگ بھی اپنی شوخی سے ہمارے خفتہ جذبات کی تسکین کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ان کا محبوب خیالی محبوب نہیں۔ وہ لمسیاتی کیف و انبساط کا ایک ایسا مرقع ہے جو بدن کی لذتوں کا راز آشنا ہے۔ بلاشبہ حسنِ بیان، خوبی، ادا اور لطافت سے راشد کا کلام متصف ہے۔ انھوں نے اپنی مربوط نظموں سے شاعری میں ایک نئی طرح ڈالنے کی کامیاب کوشش کی ہے جس سے یقینی طور پر عشقیہ شاعری کے نئے امکانات روشن ہوتے ہیں۔

—— فیاض رفعت

- ''کہرے میں اُبھرتی پرچھائیں'' آپ کی عشقیہ نظموں کا مجموعہ ملا۔ شکریہ! جس دور میں ہر کوئی سانسوں کی پوٹلی لیے محبت کے پلیٹ فارم پر اپنی گاڑی کا انتظار کر رہا ہے اور اس میں آپ کی نظموں کا روپ رنگ زندگی سے جڑاؤ کا مثبت استفادہ ہے۔ اردو کے موجودہ شعری ادب میں آپ کی منظومات اس لحاظ سے انوکھی اور مختلف ہیں کہ ان میں بنا کسی متعلقہ فلسفہ کی شمولیت کے زندگی جینے کا حوصلہ اور اس کی سرشاری نمایاں ہے۔ بہت دنوں کے بعد آپ نے ایک ایسے شاعر سے ملاقات کروائی ہے جو کربِ ذات سے دور رہ کر حسن و عشق کے نت نئے چاہتوں کا سیاح ہے۔

—— ندا فاضلی

- عشقیہ نظموں کی اس کتاب کو میں آپ کی ''خفیہ کارروائیوں'' کے زمرے میں رکھتا ہوں۔ آپ کی تخلیقی شخصیت کے ان رموز پہلوؤں سے میں اب تک واقف نہ تھا۔ آپ کو محض ایک ہونہار غزل گو کی حیثیت سے جانتا تھا۔ میں نے آپ کو ان

نو جوان العمر شعرا میں ایک خاص جگہ دے رکھی تھی جن سے کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ ہیں۔ آپ کے انہماک اور ذوق کو دیکھ کر مجھے یقین ہے کہ آپ کے فن اور بصیرت کو جلا ملتی رہے گی۔ خدا کرے آپ اسی طرح بے چین رہیں۔ اطمینان آپ کا مقصد نہ ہو۔ ''کہرے میں اُبھرتی پرچھائیں'' ماضی میں اُبھرتی ہوئی کوئی آواز معلوم ہوتی ہے۔ پہلی قرأت میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی داخلی جبر نے یہ نظمیں کہلوائیں ہیں۔ اظہار اور محسوسات کی سطح پر بھی آپ بے حد کھرے ہیں۔ تجربے کی جو سچائی ہے اسے ایک ایسی زبان میں ادا کیا گیا ہے جو مانوس ہونے کے باوجود اپنی طرف متوجہ کرنے کی کافی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہماری شاعری سے جذبے کی چمک اڑ گئی ہے۔ ہماری موجودہ تنقید کے پھیر میں پڑ کر اس نے اپنی معصومیت کھو دی۔ ان نظموں سے کم از کم آپ کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ آخر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ خود اپنے طور پر اپنا تجزیہ کریں کہ تخلیق آپ کے لیے بہتر راستہ ہے یا تنقید۔ آپ اپنی صلاحیتوں کو صرف کسی ایک کے لیے وقف کر دیں۔ تخلیقیت قدرت کا بہت بڑا انعام ہے۔ تنقید دھوکا ہی دھوکا ہے۔

——— عتیق اللہ

• راشد انور راشد نے جو عشقیہ نظمیں لکھیں وہ کسی بھی طرح فیشن گزیدہ نہیں ہیں بلکہ عشق کے حقیقی اور سچے جذبات کی آگ میں غسل کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اور یہی ان کی خوب صورتی ہے۔ میں راشد کی ان نظموں کو اس رومانی شاعری کا احیا کہوں گا جو بیسویں صدی کے نصف اوّل میں اور بڑی حد تک اس کے بعد بھی نوجوان دلوں کی دھڑکن تیز کرتی تھیں۔ راشد کی نظموں میں جہاں عشق کی آتش سیال موجزن ہے وہیں جذبات کے ترشحات کے ساتھ ساتھ خود ان نظموں کے تخلیق کار کے لامتناہی و بے کراں جذبات عشق کے خدوخال بھی مترشح ہیں۔ ان نظموں کے مطالعے سے متنوع کیفیات کا پتہ تو چلتا ہی ہے، عمر کے تبدیل ہوتے ہوئے موسموں کا سراغ بھی ملتا ہے۔ شاعر نے ان لمحوں کو اپنی تحول فکر میں لے لیا ہے جو محبوبہ کی رفاقت میں گزرے ہیں، یا

پھراس کی خوش گوار اور انبساط آمیز یادوں سے مملو ہیں۔ اس طرح نشاط وصل تو حلال ہے مگر عذاب ہجر حرام نہیں ہے۔ ہر نظم میں کچھ اس طرح کی گفتگو ہے جو مکالموں کی شکل اختیار کر گئی ہے جس سے بہت سی تصویریں وجود میں آ گئی ہیں۔ طرح طرح کے مناظر اور پیکروں کی تشکیل ہوگئی ہے اور ان میں ہمارے گرد و پیش پھیلی ہوئی زندگی بھی ہے، مظاہر فطرت کی شاداب و خوش رنگ بازی گاہیں بھی ہیں اور خیالات کے ایسے وسیع و ضوفشاں نگار خانے ہیں جو شاعر کے تخلیقی افق سے وجود کی بساط پر جلوہ ریز ہو گئے ہیں۔ یہ نگار خانے خود میں غیر فانی، جاوداں اور لازوال ہیں۔ ان نظموں میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون سی نظم دوسری نظموں سے بہتر ہے کیوں کہ ہر نظم سے تخلیق کار کے خونِ جگر کی تراوش ہو رہی ہے۔

—— عشرت ظفر

● کیا ہمارے دانش وروں، ناول نگاروں، افسانہ نگاروں، تنقید نگاروں اور ادب سے محبت رکھنے والوں اور اس کے بارے میں سوچنے والوں نے اس پر غور کیا ہے کہ ہمارے ادب سے رومان کیوں غائب ہوتا جا رہا ہے۔؟ کیا ہماری زندگیوں میں صرف تلخیاں، مایوسی، کرب، بے چینی اور خوف و ہراس باقی رہ گئے ہیں؟ ان کے علاوہ اور کچھ ہی نہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے بچپن سے سیدھے بڑھاپے کی منزلوں میں داخل ہو گئے ہیں۔ نوجوانی اور جوانی ہمیں چھو کر نہیں گئی؟ ادب اگر مسرت سے بصیرت تک کا سفر ہے تو اس میں ہمارے وہ لطیف احساسات کہاں گئے جن سے ہم میں سے تقریباً ہر شخص یقینی طور پر گزرا ہوگا، اس کے دل کی دھڑکنیں موسیقی کی طرح بج رہی ہوں گی، وہ راتوں کو جاگ کر نرم و نازک لہروں میں تیرتا ہوگا، دن میں سنہرے خوابوں کی زنجیریں پکڑنے کی کوشش کی ہوگی۔ ان تمام لازوال سوالوں اور لطیف جذبوں کو خوب صورت کشتیوں میں سجانے کا جو کام راشد انور راشدؔ نے انجام دیا ہے، وہ ایک طرح سے فرض کنایہ کی ادائیگی ہے۔ اگر چہ انھوں نے ۱۳۸ عنوانات قائم کیے ہیں لیکن یہ ساری نظمیں بے حد مربوط دکھائی دیتی ہیں۔ میں نے کئی بار ان کا

مطالعہ کیا ہے اور ہر بار ایک نئے لطف اور نئے جذبے سے آراستہ ہوا ہوں۔ میں نے شدت سے محسوس کیا ہے کہ ان میں اگر نظم بھی ہٹا دی جائے تو جو سلسلہ انھوں نے قائم کیا ہے اور جسے ہم تک پہنچایا ہے، وہ قائم نہیں رہ سکے گا۔ راشدانور راشدؔ نے ''کہرے میں ابھرتی پرچھائیں'' شائع کر کے بے شمار لوگوں کی عمر رفتہ کو آواز دے دی ہے۔ انھوں نے جس طرح خاص لمحوں کو مربوط کڑیوں میں سجایا ہے اور لمحے لمحے کا سنبھال کر کے حساب رکھا ہے، اس نے بے شمار دلوں کو تڑپا دیا ہے اور ان کے دلوں میں وہ تمام جوت کو گرمانے کی کوشش کی ہے جو بجھ کر راکھ بن چکے تھے۔ ہم تو یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ ان راکھ میں اب کچھ بھی دم نہیں۔ یہ راشدؔ کا کمال ہے کہ انھوں نے ان میں دبی چنگاریوں کو کرید کرید کر زندہ کیا اور ان میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ اس مجموعے میں اکثر نظمیں ایسی ہیں جنھیں بار بار پڑھنے اور بار بار گنگنانے کو جی چاہتا ہے۔ پتہ نہیں راشدؔ ان کی تخلیق کے وقت کن جذبوں اور احساسات سے گزرے ہوں گے۔ انھوں نے نہایت بے تکلفی سے اپنے پڑھنے والوں کو بھی اپنا ہم سفر بنا ڈالا ہے۔ ان کے ساتھ ایک قافلہ ہے جو چل پڑا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس سفر کی منزل ابھی نہیں آئی۔

——عبدالصمد

- موسم کی مبارک باد کے اس کارڈ کا انتخاب اس لیے بھی کیا کہ لفافے سے آپ خط کا مضمون بھانپ لیں کہ یہ خط مبارک باد کی نیت سے لکھا جا رہا ہے۔ آپ کی خوب صورت، تہہ دار نظموں اور ان میں بیان کردہ مختلف جذبوں سے جی سرشار ہوا۔ آپ کی نظموں کی کیفیت بالکل مختلف ہے۔ آپ کا عشق نامہ، عرفان صدیقی کے عشق نامے سے مختلف ہے۔ صنف کے اعتبار سے بھی اور جذبوں کے لحاظ سے بھی۔

——سید محمد اشرف

- دیارِ عشق کی راہیں پُرپیچ ہوتی ہیں اور منزل سراب ہوتی ہے۔ کبھی نگہ میں حسیں خواب چلتے ہیں تو کبھی آنکھوں سے خون برستا ہے۔ شاعر کے لیے یہ تضاد کوئی معنی نہیں رکھتا۔

دونوں صورتیں اس کے لیے تسکین کا سبب بنتی ہیں۔ اس کے لیے تسکین ہی اضطراب ہے اور اضطراب ہی تسکین۔ ایسی ہی متضاد کیفیتوں کی خوب صورت عکاسی راشد انور راشدؔ نے عشقیہ مجموعے ''کہرے میں اُبھرتی پرچھائیں'' میں کی ہے۔ عشقیہ نظموں کے اس مجموعے میں وہ ایک عاشق کی حیثیت سے اپنے دل کی ہر کیفیت کو شعری پیکر عطا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ حقیقی زندگی کی ناکامیاں ہی عشق کو دوام اور شاعری کو استحکام بخشتی ہیں۔ اس مجموعے میں عشق کے مختلف زاویوں، متضاد تجربوں اور پیچیدہ جذبوں کو راشد انور راشد نے نہایت حسن وخوبی کے ساتھ نظموں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں عشق ایک فلسفہ نہیں بلکہ زندگی کی حقیقتوں، داخلی کیفیتوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا فلسفیانہ اور تخلیقی اظہار ہے۔

—— طارق چھتاری

- ''کہرے میں اُبھرتی پرچھائیں'' کی تمام ۱۳۸ نظمیں معرّیٰ ہیں۔ مجموعی طور پر دل کشی اور تاثیر کی وحدانیت کی خوبی ان نظموں میں موجود ہے۔ راشدؔ کی نظمیہ شاعری پوری کی پوری عشق سے عبارت ہے۔ یہ نظمیں عاشق کی جانب سے رفاقت اور Companionship کی شدید آرزومندی کا اظہار ہیں۔ اس میں ایک طرف والہانہ پن ملتا ہے، لیکن لذت وصل اور شہوانیت کی تسکین کی باتیں نظر نہیں آتیں۔ وہ نظمیں جو نہ جنس سے، نہ روحانیت سے علاقہ رکھتی ہوں، نہ باب جمالیات پر دستک دیتی ہوں، پھر بھی عشقیہ شاعری کے ذیل میں آتی ہوں، ان کی چنگاریوں کو کہرے سے نکال کر ایک بار ان کا معائنہ ضرور کرنا چاہیے کہ یہ کس چقماق کی پیداوار ہیں۔ ایسے شرارے شیکسپیئر کے کسی کسی سانیٹ سے نکلتے دکھائی دیتے ہیں۔

—— ف س اعجاز

- عہد بہ عہد عشق کے انداز اور قرینے چاہے کتنے ہی تبدیل ہوتے رہیں، عشق بجائے خود ایک دائمی اور آفاقی قدر ہے۔ اس حقیقت کو راشد نے مجموعے کی مختلف نظموں میں پیش کیا ہے۔ یہ مجموعہ رومانی نظموں کا ایک کولاژ نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک یہ نظمیں اپنی

ترتیب کے لحاظ سے مرحلہ وار ہیں۔ پہلا مرحلہ عشق کی طلب کا ہے۔ کسی کو چاہنے اور کسی سے چاہے جانے کی آرزو، نگاہوں میں بستے ہوئے سہانے خواب، دل کی اُبھرتی ہوئی دھڑکنیں۔ اس مرحلے کی نظمیں عام نوجوانوں کے دلوں کے مشترکہ جذبوں پر مشتمل ہیں۔ دوسرا مرحلہ عشق کی یافت کا ہے، اپنے محبوب کے حصول کا ہے، محبت کے رشتۂ ازدواج میں بندھ جانے کا ہے۔ اس قبیل کی نظموں میں سرشاریاں ہیں، کسک ہے، کھٹی میٹھی یادیں ہیں، روٹھنا منانا ہے اور ازدواجی زندگی کی کئی رومانی اور جذباتی جھلکیاں ہیں۔ انھیں پڑھتے ہوئے کہیں دور سے جاں نثار اختر کی ''گھر آنگن'' کی رباعیاں بھی ذہن میں اُبھرتی ہیں، مگر ان کا پیرایہ بالکل دوسرا ہے۔ تیسرا مرحلہ جس کی نظمیں اس کتاب کے نصف دوم سے زائد رقبے پر محیط ہیں، زیادہ متنوع ہیں۔ یہاں عشق کے دائرے کی توسیع میں شمولیتِ غیر کا انتشار ہے، الجھنیں ہیں، جذباتی پیچ وخم اور نفسیاتی زیر و بم ہیں۔ عاشق اور معشوق کا شریک سفر بن جانا عشق کی کامیابی ہے یا ناکامیابی، یہ عقدہ آج بھی لاینحل ہے۔ ایک طرف ازدواج، محبت کے رشتے کو پائیدار کر دیتا ہے تو دوسری طرف ایک دوسرے کو پانے کی تشنگی اور کھو دینے کا خوف محسوسات کی دھار کو تیز اور ڈور کو کساؤ دیے رہتا ہے۔ راشد انور راشد کے یہاں یہ دونوں دھارے متوازی چلتے ہیں اور وہ بھی اپنے پیکر محسوس اور چہرۂ موسوم کے ساتھ۔

—— عبدالاحد ساز

• میرے لیے راشد صاحب کا چونکانے والا تخلیقی تجربہ ان کی نظموں کا ضخیم مجموعہ ''کہرے میں اُبھرتی پرچھائیں'' ہے جس کو میں نے جب بھی پڑھا ہے، محو ہو گیا ہوں۔ اس مجموعہ میں موجود نظمیں تجربوں کی ایسی مثالیں پیش کرتی ہیں جو شاید اردو ادب میں پہلی مرتبہ ضبط اور احتیاط اور شرح وبسط کے ساتھ ضابطۂ تحریر میں لائی گئی ہیں۔ اس مجموعہ کی ہر نظم ایک نیا عشقیہ تجربہ پیش کرتی ہے بلکہ میں یہ کہوں گا کہ اس کی تمام نظمیں گرچہ موضوعاتی سطح پر جدا جدا ہیں، لیکن انھیں ایک دوسرے الگ کر کے دیکھا بھی نہیں جا سکتا کیوں کہ شاعر نے ایک موڈ میں پلاننگ کے تحت یہ نظمیں لکھی ہیں۔ راشد صاحب کا

یہ مجموعہ جدید اردو شاعری میں ایک منفرد تجربہ کی حیثیت رکھتا ہے اور نظم نگار شاعر کی حیثیت سے راشد انور راشد ممتاز نظر آتے ہیں۔

—— جمال اویسی

- راشد انور راشد ہر چند کہ ادب کے میدان میں قلمی سطح پر تنقید سے بھی سروکار رکھتے ہیں، لیکن وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ پیش نظر شعری مجموعہ ان کی ۱۳۸ عشقیہ نظموں پر مشتمل ہے۔ شاعری کا حدیث دلبری بن جانا ایک فطری بات ہے لیکن حدیثِ دلبری کے آیات و آثار کی تفہیم تو کیف و وجدان کے سرور آگہی لمحات میں ہی ممکن ہے، جب کہ یہ لمحات پلکوں پر جھلملاتے اور لرزتے خواب کی مانند ہوتے ہیں۔ ''کہرے میں اُبھرتی پرچھائیں'' ہماری نگاہوں کو متجسسانہ تشنگی سے دوچار کرتی ہے۔ یہ تشنگی دیے میں تیل کا کام کرتی ہے۔ ہماری نگاہوں کی لویں تیز سے تیز تر ہوتی رہتی ہیں تاکہ پرچھائیں روشن ہو سکے۔ اس کا سراپا اپنے جمال و زیبائی اور حسن و رعنائی کے ساتھ اُبھر کر سامنے آئے اور آنکھوں کی ٹھنڈک اور قلب کی راحت بن جائے۔ مجموعے کی نظمیں پڑھ کر ہماری یہ تشنگی برقرار رہتی ہے۔ تجسس اور تحیر کا مرحلہ طویل ہوتا جاتا ہے۔ اس میں خواب ناکی کے عناصر گھلتے ملتے چلے جاتے ہیں اور آسودگی کی ایک خاص کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ یہی متاعِ عاشقی بھی ہے اور سرمایۂ شاعری بھی جو کہرے میں اُبھرتی پرچھائیں کے روپ میں ہمارے دیدۂ بینا کو تابندگی عطا کرتی ہے اور سازِ دل کو خروشِ مستی سے نغمہ زا بناتی ہے۔ اس مجموعے کا پہلا اختصاص یہ ہے کہ ساری نظمیں ہیں، دوسرا یہ کہ سب معریٰ نظمیں ہیں اور تیسرا اختصاص یہ ہے کہ عشقیہ نظمیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نئی نسل کے شاعروں میں راشد انور راشد کے امتیاز اور انفرادی شناخت کا تعین اسی حوالے سے ہوگا۔

—— منظر اعجاز

- ''کہرے میں ابھرتی پرچھائیں'' رومانی اور عشقیہ شاعری کی بہترین مثال ہے۔ اس مجموعے کی نظموں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ راشد نے اردو نظم کے روایتی ذائقے سے

انحراف کرتے ہوئے ایک خاص ذائقے کی دریافت کی ہے جس میں عشق کی سرمستی اور استعاروں کی وسعت کے ساتھ سپردگی اور ربودگی کی شان بھی ہے۔ عشق سرائے کے سفیر راشد کے یہاں عشق کی حدت بھی ہے اور چاشنی بھی جس نے ان کی نظموں میں نورانیت کیفیت پیدا کردی ہے۔ آج کے اس انحطاط پذیر معاشرے میں جہاں ہر شے صارفی و بازاری ہے، افراتفری کا ماحول ہے، رشتوں کی پامالی ہے، جذبوں میں انجماد ہے، حزن و ملال کا ذخیرہ ہے، آلام و مصائب کی بھیڑ ہے، دل کے ٹوٹنے کی صدا نقار خانے میں گم ہے۔ ایسے ماحول میں ''کہرے میں ابھرتی پرچھائیں'' روح کی سرشاری، طبیعت کو انفراح اور ذہن کو تسکین پہنچاتی ہے اور یہی اس کے پڑھنے کا جواز بھی ہے۔

—— عاصم شہنواز شبلی

- دنیائے ادب کا سب سے اہم موضوع یا مضمون عشق کو اس مجموعے میں مابعدالطبیعاتی سیاق میں پیش کرنے کے بجائے راشدؔ نے جس طرح سے عشق کے مسائل کو معاشرتی اور زمینی سطح پر محسوس کرنے کا نیا سیاق قاری کے سامنے پیش کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ یہ روایتی نظمیں نہیں ہیں جو اختر شیرانی کے یہاں نظر آتی ہیں۔ یہاں انسانی رشتوں کے درمیان پل کا کام کرنے والے عشقیہ رموز کو ذاتی تجربے کا استعارہ بنایا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ شاعر کی اپنی سوانح ہے لیکن ان عوامل کو لاشعور کی ایک ایسی جہت عطا کی گئی ہے کہ سب کچھ نجی نہ ہو کر آفاقی اور علامتی رنگ میں سامنے آتے ہیں اور کائناتی اور آفاقی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ ان نظموں میں خاندان کی بنیاد رکھنے والے دو نفوس مرد اور عورت کے درمیان عشق کے معنی کے انہدام کے المیے کو پیش کیا گیا ہے اور مشترکہ خاندان ہی کیا، نیوکلیر فیملی کی بھی موت کا مژدہ سنایا گیا ہے۔

—— مولا بخش

- ''کہرے میں اُبھرتی پرچھائیں'' راشدؔ کی ایسی کتابِ عشق ہے جس کے مطالعے سے انسان کا وجود روشنیوں سے بھر جاتا ہے۔ ان کے نظریۂ عشق کی خوبی یہ ہے کہ وہ عشق

کے فطری زمینی معاملات میں کبھی بھی اور کہیں بھی ضبط واعتدال اور تہذیب وشائستگی کا دامن نہیں چھوڑتے۔ ان کی نظموں میں وہ سوز دروں ہے جس سے قلب و باطن کی آگ روشن ہو جاتی ہے۔ ان کی عشقیہ نظمیں اپنا خمیر مجازی و زمینی عشق کی نشاط انگیز سرمستی اور درد و سوز سے حاصل کرتی ہیں، لیکن یہ فقط شباب میں شرابور نہیں ہیں بلکہ ان کے تجربات اور احساسات کا رُخ پوری کائنات کی طرف نظر آتا ہے۔

—— مشتاق صدف

- خوشی کی بات ہے کہ راشدؔ کو غزل اور نظم کی ہیئت کے مابین افتراق، دونوں کے الگ الگ صنفی تقاضے، خیال کی سمائی کے الگ الگ پیمانے، ایجاز و تفصیل کے برتنے کا فرق جیسے نازک تخلیقی معاملات کا شدت کے ساتھ احساس ہے جس کی شناخت راشد کے باطن میں پوشیدہ خود آگاہ اور متحرک تخلیقی فن کار کے طور پر کی جاسکتی ہے۔ راشد نے سرسری طور پر یا صرف فیشن کے انداز میں نظمیں کہنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ نظم کے صنفی تقاضے ان کے لیے اس قدر سنجیدہ مسئلے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ نظم کہنے کی تکنیک اور نظم کی بُنت کا مسئلہ ان کے لیے فرسٹ ہینڈ مسئلہ کے طور پر نمودار ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے دنیا کا ہر انسان جب عشق کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ مجھ سے پہلے تو صحیح معنوں میں کسی نے عشق کیا ہی نہیں تھا۔ راشد کی عشقیہ نظموں میں موضوعات کا تنوع بھی ہے، نظم کی ہیئت و تسلسل کا کامیاب تجربہ بھی، نظم کی نئی زبان کی تشکیل بھی ہے اور نظم کی بنت کا کمال بھی۔ ان نظموں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ راشد نے اپنی نظموں میں خیال کے بہاؤ کو جہاں ایک طرف خوب پھیلایا ہے وہیں دوسری طرف خیالات کی ٹھاٹھیں مارتی موجوں کو وحدتِ تاثر میں تبدیل کر دینے کے تخلیقی طلسم سے بھی وہ بخوبی واقف ہیں۔

—— سرور ساجد

OOO